مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

وہاب قیصر

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Maulana Azad ki Scienci Baseerat

by
Wahab Qaiser

سنہ اشاعت	:	اکتوبر، دسمبر 2004، شک 1926
اڈیشن	:	1100
قیمت	:	-/109
سلسلۂ مطبوعات	:	1184

ISBN : 81-7587-075-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی 66
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

مولانا آزاد کا خیال آتے ہی ہندوستانی قومی تحریک کی ایک پوری کہکشاں نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ بے شمار واقعات اور شخصیتیں اور ایک پوری نسل کے لوگ جن کا ہر فرد اپنے آپ میں ایک عظمت کا مالک تھا۔ لیکن مولانا کی شخصیت قومی تحریک آزادی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے نئے نئے گوشے روز بروز روشن ہوتے جارہے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ تفسیر و تفہیم، صحافت و ادارت، سیاست و قیادت میں لاثانی تھے اور اُن کے اِن پہلوؤں پر کافی کچھ لکھا بھی گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اُن کی سائنسی بصیرت پر پہلی بار قلم اٹھایا گیا ہے جس میں مولانا کے سائنسی ادراک و شعور کو اُن کی تحریروں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، اور سارے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں جہاں تک ممکن ہو سکے پوری کی جائیں، اور نصابی و غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی اپنی اہمیت ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زبان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اُسے سماجی علوم، سائنس اور ٹکنالوجی سے جوڑنا بھی ضروری ہے اور علوم انسانیہ سے بھی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

قوی امید ہے کہ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ اہل علم سے گذارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

فہرست

ولی تنویر

پرویز یداللہ مہدی

طالب خوندمیری

اور

مظہر الزماں خاں

کے نام

مختصر تعارف

قلمی نام	:	وہاب قیصر
اصلی نام	:	سید عبدالوہاب
ولدیت	:	سید عبدالستار مسکین (مرحوم)
پیدائش	:	5 ستمبر 1949ء حیدرآباد
تعلیمی قابلیت	:	ایم ایس سی' پی ایچ ڈی (طبیعیات)' جامعہ عثمانیہ' حیدرآباد
پیشہ	:	تدریس
عہدہ	:	ڈائرکٹر فاصلاتی تعلیم
		انچارج وائس چانسلر (8 جنوری 2003 تا 18 مارچ 2004)
		مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' حیدرآباد۔ 32
ادبی سفر	:	1968ء میں افسانہ نگاری سے شروع ہوا
		1970ء سے سائنسی موضوعات پر لکھنے کا سلسلہ قائم ہوا۔
تصانیف	:	1) سائنس کے نئے افق (1996ء) سائنسی مضامین
		2) سائنس اور غالب (2000ء) تحقیق و تنقید
		3) سوالوں میں رنگ بھرے (2003ء) سائنسی مضامین
پتہ	:	19-2-27/A/1/1 جہاں نما حیدرآباد 500053' آندھرا پردیش

غبارِ تحقیق

28 دسمبر 2002ء کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ''آزاد ڈے'' منایا جانے والا تھا۔ مقررین کی فہرست میں احقر کا نام بھی شامل تھا۔ تقریر کی تیاری کے دوران جب میں نے چند کتابوں کی ورق گردانی کی تو مولانا ابوالکلام آزاد اور سائنس میں کافی گہرا تعلق پایا۔ تب میں نے ارادہ کیا کہ مستقبل قریب میں اس موضوع پر ضرور قلم اٹھاؤں گا۔ جلسہ میں جب میں نے اپنی تقریر بعنوان ''مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی'' ختم کی تو مہمان خصوصی جناب آئی کے گجرال سابق وزیراعظم حکومت ہند نے ''بہت خوب! بہت خوب!!'' کہتے ہوئے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ گجرال صاحب کی ہمت افزائی نے ارادے کو مزید تقویت پہنچائی۔ مولانا آزاد کی تحریر کردہ اور ان پر لکھی گئی متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انجام کار یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ فطرت میں ظہور پذیر کوئی بھی واقعہ علم و فن کے مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والوں کو مختلف طریقوں سے متاثر کرتا ہے اور اس کا ردعمل بھی مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعر' شعر کہتے ہیں۔ نثر نگار' نثری پیکر تراشتے ہیں۔ پینٹر' برش کے اسٹروک سے اس کو قید کر لیتے ہیں۔ فوٹو گرافر' کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اس کے عکس کو سلولائیڈ پر اتار دیتے ہیں۔ ہم جیسے مضمون نگار' سائنس کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے سائنسی پہلوؤں کو تحریر میں سمو دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا آزاد کی شخصیت و فن کے ساتھ میرا یہی رویہ رہا۔ ان کی سوانح' تحریریں' صحافت اور وزارت میں جہاں کہیں بھی سائنسی مزاج' سائنسی اصول اور سائنسی برتاؤ نظر آئے انہیں ضبط تحریر کیا۔ اس طرح یہ تحریریں ''مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت'' کے پیکر میں ڈھل گئیں۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''مولانا آزاد کا سائنسی ادراک'' ہے۔ اس باب میں مولانا کے لئے سائنس کی تعلیم کا حصول' ان کے سائنسی علوم میں دلچسپی اور مطالعہ کے ذوق پر روشنی ڈالی

گئی ہے۔ دوسرے باب ''مولانا آزاد کا سائنسی شعور' صحافت کے آئینہ میں'' کے زیر عنوان مولانا کی شخصیت میں بحیثیت صحافی اور نثر نگار سائنسی مزاج کو تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد نے بحیثیت ایڈیٹر و معاون ایڈیٹر اخبارات اور رسائل میں نہ صرف سائنسی موضوعات پر مضامین کی اشاعت کو فوقیت دی بلکہ انہوں نے خود کئی ایک مضامین لکھے۔ ان مضامین کے اقتباسات مولانا کے سائنسی شعور کی وضاحت کے لئے اس باب میں شامل کئے گئے ہیں۔ تیسرا باب '' غبارِ خاطر' سائنس کے تناظر میں'' ہے۔ اس کی ابتدا اردو ادب کے ماہرین دانش و بینش کی تحریروں کے اقتباسات سے ہوتی ہے۔ '' غبار خاطر'' میں نمودار ہونے والے سائنسی پرتو اور مولانا کے سائنسی برتاؤ کا اقتباسات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ان اقتباسات میں سہل پسندی کی خاطر عربی اور فارسی اشعار سے اجتناب کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کا ایک مقالہ '' البیرونی اور جغرافیۂ عالم'' آزاد بھون' نئی دہلی میں مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ اس مقالہ کو پروفیسر ضیاالحسن فاروقی اور مسیح الحسن نے 1980ء میں کتابی شکل میں شائع کروایا تھا۔ چوتھا باب '' البیرونی اور جغرافیۂ عالم' ایک تجزیاتی مطالعہ'' اسی کتاب کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ پانچواں اور آخری باب ''مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی'' ہے۔ اس باب میں گیارہ سالہ دور وزارت میں مولانا کے اٹھائے گئے ان اقدامات سے روشناس کرایا گیا ہے جن کی بدولت آزاد ہندوستان کو سائنس کی ترقی اور ٹکنالوجی کے فروغ میں ایک نئی سمت ملی۔

میں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ' ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو کونسل کے زیر اہتمام شائع کر کے راقم کی حوصلہ افزائی کی۔

حیدرآباد

فروری 2004ء

وہاب قیصر

مولانا آزاد کا سائنسی ادراک

مولانا ابوالکلام آزاد 1888ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا پیدائشی نام فیروز بخت تھا۔ ان کے والد مولوی خیر الدین مشہور عالم اور پیرومرشد تھے۔ ان کی والدہ عرب نژاد تھیں۔ مولانا آزاد دو بھائی اور تین بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے بھائی ابوالنصر آہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ بڑی بہن کلکتہ منتقلی سے قبل ہی قسطنطنیہ میں انتقال کر گئیں۔ دوسری دو بڑی بہنیں فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو بھی شعر کہتی تھیں۔ 1898ء میں ان کی فیملی ہمیشہ کے لئے ہندوستان منتقل ہوگئی اور کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس منتقلی کے چند ہی مہینوں بعد ان کی والدہ کی وفات ہوگئی۔ بھائی بہنوں کے ساتھ ان کی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی رہا۔ عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم ان کے والد دیا کرتے تھے۔ اردو پڑھنے کا شوق انہیں خود بخود پیدا ہوا۔ جس کو انہوں نے مکہ میں شروع کیا تھا۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنی بڑی بہن آبرو بیگم اور حافظ بخاری سے اردو پڑھی۔

مولانا آزاد کے والد اپنے بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے مطابق والد کی تربیت اس قدر شدید اور سخت تھی کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ مولانا کے والد کا یہ ماننا تھا کہ باہر کی آب وہوا ان کے بچوں کے لیے مضر ثابت ہوگی۔ چنانچہ مولانا کی پوری دنیا، تعلیم، کھیل کود اور سیر و تفریح، تمام کی تمام ان کا مکان اور والد کا حلقہ تربیت تھی۔ گھر پر فلسفہ، اقلیدس، ریاضی و الجبرا کے لئے الگ الگ مدرسین کا انتظام کیا گیا تھا اور بہت جلد انہوں نے ان مضامین پر مہارت حاصل کر لی۔ دس برس کی عمر ہی میں انہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہوگیا تھا۔ ناشتہ کے لئے جو پیسے ملتے تھے انہیں جمع کرتے اور کتابیں خریدا کرتے۔ تیرہ، چودہ سال کی عمر کو پہنچنے تک انہوں نے اسلامی علوم اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ عربی، فارسی اور ترکی ادب کے مطالعہ کے علاوہ علم کیمیا اور علم فلکیات پڑھ چکے تھے۔ علم منطق اور طب کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ 1903ء میں جب کہ ان کی عمر پندرہ سال تھی، درس نظامی کی تکمیل کی۔ جس کے لئے

عام طور پر لوگوں کو تیرہ چودہ سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ مولانا نے یہ کام صرف چار برس میں کر دکھایا۔ انہوں نے انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان بھی سیکھی۔ ان زبانوں کے سیکھنے میں ان کی ذاتی دلچسپی اور محنت کو بڑا دخل تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کی مہارت بھی حاصل کی۔

مولانا آزاد کے ذہن کی نشوونما کا یہ عالم تھا کہ چودہ سال کی عمر میں ''مرقع عالم'' کے بزرگ ایڈیٹر محمد علی کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے رسالے میں ناولوں کی قسط وار اشاعت کی بجائے سائنسی اور علمی مضامین کو ترجیح دیں۔ لڑکپن میں لوگ جہاں کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں وہیں مولانا کتاب لے کر کسی گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ یہاں تک کہ جب کبھی والد کے خادم کے ہمراہ سیر کے لئے نکلتے تو کوئی نہ کوئی کتاب اپنے ساتھ لے جاتے اور وہاں بھی مطالعہ کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کر لیتے۔ کتابیں پڑھنے کا ایسا چسکہ لگا تھا کہ ہندوستان کے تمام کتب فروشوں کے پاس سے کتابوں کی فہرستیں منگواتے اور جو بھی کتابیں اچھی لگتیں، ان کی ایک فہرست مرتب کر لیتے۔ کلکتہ میں مولوی ضیاء الرحمٰن کی کتابوں کی دکان تھی، ان سے مطلوبہ کتابیں منگواتے اور ان کا مطالعہ کیا کرتے۔ مولانا کے والد کے ہاں کئی اخبارات آیا کرتے تھے اور ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ تھا۔ والد کے انتقال کے بعد ان اخبارات کے پرانے شماروں اور کتابوں کے ذخیرے سے مولانا کو استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

مولانا آزاد کو جدید علوم کے حصول کا شوق اس وقت پیدا ہوا جب انہوں نے سر سید احمد خان کے مضامین کا مطالعہ کیا۔ ان کے پڑھنے کے شوق میں جو نمایاں تبدیلی آئی اس کے بارے میں عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت پر مبنی کتاب ''آزاد کی کہانی، خود ان کی زبانی'' میں وہ فرماتے ہیں :

> ''سرسید کی تصنیفات کے مطالعے نے علوم جدیدہ سے نہ صرف آشنا بلکہ شائق و گرویدہ بنا دیا تھا۔ اب وہ دن تھا کہ عقائد وافکار میں ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔ میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی، بہہ رہی تھی۔ تمام قدیم چیزیں حقیر و ذلیل ہو چکی تھیں۔ علوم جدیدہ اور یہ ترکیب سرسید مرحوم ہی کی ہے، اور ہر وہ

چیز' جو ان کی طرف منسوب ہو' میرے قلب و ذہن کے لئے بمنزلہ معبود کے تھی۔ اب شوق ہوا کہ اردو' فارسی' عربی میں نئے علوم کی جتنی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں' انہیں جمع کیا جائے۔ مولوی حالی مرحوم کی کتاب جیالوجی' جو مصر کے ایک عربی ترجمے کا ترجمہ ہے' پیرزادہ محمد حسین کی منطق استقرائی اور ٹنیسن کا لکچر کا ترجمہ' لارڈ بیکن کی سوانح عمری' سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے بعض تراجم مثلاً پولیٹیکل اکانومی وغیرہ اور پنجاب کی لٹریری سوسائٹی کی کتابیں قائم کردہ ڈاکٹر لائٹزکہ مولوی حالی مرحوم بھی اس کے ایک مترجم تھے' مولوی ذکا اللہ کے بعض ترجمے' لکھنو چرچ مشن کے ابتدائی عہد کے علمی تراجم' سرکاری یونیورسٹیوں کے تعلیمی اور علمی سلسلے کی تمام کتابیں منگوائیں اور شوق سے دیکھیں' مگر ان سے طبیعت کو سیری نہ ہوئی۔ اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون کون ہیں اور کہاں کہاں ملیں گے؟ یہ پہلا خط ہے' جو میں نے مولانا کو لکھا۔ انہوں نے دو سطروں میں یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجیے! خیر میں نے پہلے وہاں سے فہرستیں منگوائیں اور پھر کتابیں منگواتا رہا۔"

(ص234-235)

مولانا آزاد عصری علوم کی تمام کتابیں چاہے وہ اردو' عربی' فارسی یا انگریزی' کسی بھی زبان میں دستیاب ہوں' انہیں حاصل کرتے اور ان کا مطالعہ کرتے۔ کلکتہ سے مولوی احمد حسن فتح پوری عربی میں ''احسن الاخبار'' نکالتے تھے۔ ان کے ہاں مبادلے میں مصر' شام اور طرابلس کے اخبارات اور رسائل آیا کرتے تھے۔ جن سے نئی عربی کتابوں کے بارے میں انہیں جانکاری حاصل ہوئی اور وہ ان کا انتخاب

کر کے مطالعہ کے لئے کتابیں منگوانے لگے۔ چنانچہ سائنسی علوم پر جو کتابیں عربی میں شائع ہوئی تھیں ان میں سے بیشتر کتابیں انہوں نے حاصل کیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ کلکتہ میں ہی حکیم عبدالرحیم دہلوی نامی ایک عمر رسیدہ بزرگ رہتے تھے جنھیں اردو کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے پاس تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں جن میں سے بہت سی کتابیں ناپید ہو چکی تھیں۔ مرحوم کی بیوی نے جب کتابوں کی فروخت کا اعلان کیا تو مولانا نے ان میں سے بہت سی کتابیں خرید لیں۔ اردو کی نئی کتابیں پڑھنے کے لئے سر سید احمد خان کی تمام کتابیں منگوائیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ سر سید کی کتابیں پڑھنے کے بعد دیگر کتابیں ان کی نظر میں نہیں جچیں۔ خدا بخش نامی ایک تاجر کتب تھے ان کے ہاں سے بھی مولانا کو قیمتی اور نادر کتابوں کا ذخیرہ ہاتھ لگا تھا۔ ان کتابوں میں جدید علم ہیئت اور انگریزی کی تمام مطبوعات جو کلکتہ یا مدراس میں طبع ہوئی تھیں ان کے تراجم مثلاً رسالہ قلبیہ' مقاصد علوم' جامع بیان ریاضی' رسالہ در علم فزک (فزکس) اور رہنمائے علوم شامل تھے۔ رسالہ قلبیہ کے بارے میں '' ان کی کہانی ' خود ان کی زبانی '' میں مولانا یوں فرماتے ہیں :

'' رسالہ' قلبیہ ' علم تشریح جدید اور مسئلہ دوران خون پر اس زمانے کی مشرقی تصنیف ہے۔ جب کہ یورپ میں نئی نئی یہ تحقیقات مکمل ہوئی تھی۔ مدراس میں مرزا محمد جان ' انگریزوں کے میر منشی اور معلم ہیں اور علمائے ہند کی واقفیت کے لئے چند انگریزی کتابوں سے ترجمہ کرکے عربی میں لکھتے ہیں۔ عربی عبارت اتنی پختہ اور صحیح مصطلاحات پر مبنی ہے کہ اس زمانے میں اس طرح کے قدیم و جدید نوق کا اجتماع حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ ''

(ص237-238)

مولانا عبدالرزاق کانپوری کو لکھے گئے ایک خط کے آخر میں مولانا آزاد سائنس کی کتابوں کے بارے میں اس طرح دریافت کرتے ہیں:

'' .... دیگر یہ تحریر فرمائیں کہ آج کل سائنس کی جو کتابیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں ' ان کے ترجمے اردو میں بھی

دستیاب ہوتے ہیں ؟ اگر یہ سچ ہے تو کہاں ہوتے ہیں ؟ تحریر کیجیے گا۔

خادم العلماء

غلام محی الدین آزاد کان اللہ لہ "

(خطوط ابوالکلام آزاد ۔ مرتب مالک رام ۔ ص ۱۹)

مولانا آزاد جس زمانے سے تعلق رکھتے تھے اس میں ہر پڑھے لکھے شخص کے لئے علم طب سے واقفیت رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ ان کے والد خود طب میں دخل رکھتے تھے اور اپنے دونوں بیٹوں کی باضابطہ تعلیم کے لئے انہوں نے ایک حکیم صاحب کو مقرر کیا تھا۔ طبی تعلیم کا سلسلہ سات آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اور حکیم صاحب کے اپنے وطن لوٹ جانے پر منقطع ہوگیا ۔ اس کے باوجود مولانا نے اپنی خداداد صلاحیت، ذاتی محنت اور مطالعہ کے شوق سے طبی معلومات میں وسعت پیدا کرلی ۔ قدیم طب کے ساتھ ساتھ وہ جدید طبی سائنس پر بھی دسترس رکھتے تھے ۔ اس سلسلہ میں چراغ حسن حسرت 1915ء میں پٹنہ کی طبی کانفرنس کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو حکیم اجمل خاں کی صدارت میں بہت ہی بڑے پیانے پر منعقد ہوئی تھی ۔ اس کانفرنس میں مولانا آزاد بھی موجود تھے ۔ کانفرنس کے داعی چند طبیبوں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ اس موقع پر کچھ کہیں ۔ حکیم اجمل خان نے بھی سفارش کی ۔ چنانچہ مولانا آزاد نے قدیم اور جدید طب کے نظریات، طریقہ علاج اور مختلف بیماریوں کے لئے سودمند دواؤں پر پورے دو گھنٹوں تک تقریر کی ۔ کلکتہ کے ایک مشہور طبیب، حکیم نثار احمد جو اس کانفرنس میں شریک تھے ان کے خیال میں مولانا نے اپنی تقریر میں طب سے متعلق جو باتیں بتلائیں وہ بہت سے نامور اطبا کو بھی معلوم نہیں تھیں ۔

مولانا آزاد پر سائنسی علوم کا مطالعہ اس قدر اثر انداز ہوا کہ ان کی اکثر تحریروں میں چاہے وہ کسی بھی موضوع پر کیوں نہ ہو سائنسی اصول کی آمیزش نظر آتی ہے ۔ چنانچہ ان کی تصنیف ''تذکرہ'' میں کئی ایک مقامات پر سائنسی اصول اور سائنس کی حقیقتیں تمثیلوں کے طور پر اجاگر ہوتی ہیں ۔ ایک عالم اور بزرگ دین کے بارے میں وہ کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :-

" ...... جس طرح بینائی رکھنے والا دیکھنے پر مجبور ہے کہ خود اپنی آنکھیں پھوڑ نہیں سکتا، اُسی طرح علمائے حق اعلان و تذکیر حق میں ناچار ہیں کہ خدا کی دی ہوئی زبان کو کاٹ کر

پھینک نہیں دے سکتے ' اور بیان حق کا قدرتی خاصہ یہ ہے کہ دلوں میں گھر کرے اور ہر طرف سے انسانوں کو اپنی جانب کھینچ لے ۔ ایک داعی حق اور واصل باللہ اگر دنیا سے کہہ بھی دے کہ میرے پیچھے نہ آو ' جب بھی وہ اسی کے پیچھے دوڑے گی کہ جذب و انجذاب کا قانون الہیٰ باطل نہیں ہوسکتا ۔ پھر اگر لوہا مقناطیس کی جانب کھینچتا ہے ' تو اس میں مقناطیس کا کیا قصور ؟ یہ جرم ہے تو خدا نہ کرے کہ اس پاک جرم کے مجرموں سے کبھی اس کی زمین خالی ہو ۔......

نظام شمسی کی طرح نظامِ انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں ' مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم ! تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم ' عالم انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کیلیے کتنا زمانہ درکار ہوگا ! تاہم یہ معلوم رہے کہ ہر عہد و دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبۂ انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظام شمسی کا ہرمتحرک ستارہ صرف اسی لیے ہیکہ کعبۂ شمس کا طواف کرے ' اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اسی لیے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت کا طواف کریں ......" (ص75-76)

نبیوں کے تذکرے میں ایک مقام پر وہ فرماتے ہیں کہ نبی کے ساتھ پہلی جماعت جو ہوتی ہے وہ صدیقین ہی کی ہوتی ہے۔اس جماعت کی صدیقیت کے بارے میں وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"صدیقیت کی مثال اس نہایت قوی بصارت کی سی ہے جو سب سے پہلے دور کی چیز دیکھ لیتی اور باریک سے باریک ذرہ کو ڈھونڈھ نکال لیتی ہے ' حالانکہ دوسری کمزور آنکھیں اس وقت دیکھتی ہیں جب وہ چیز بالکل سامنے آجاتی ہے ' یا اجالا بہت زیادہ

ہوچکتا ہے ۔ یا صدیقین کے قلب کو تزکیہ، فطرت و استعداد اثر پذیری کی وجہ سے ایک ایسا مصفا آئینہ تصور کرنا چاہیے جس میں جمال نبوت و حسنِ حقیقت سب سے پہلے پرتوافگن ہوجاتاہے کیونکہ کمال جلاو صفا کی وجہ سے کوئی چیز انعکاس میں مانع نہیں ہوتی ۔

آئینے اور بھی ہزاروں ہوتے ہیں اور بوجہ آئینہ ہونے کے اصلاً انعکاس کے لیے مستعد ' لیکن کثافت و زنگ کی وجہ سے فوراً عکس قبول نہیں کرسکتے اور کچھ عرصہ کی صفائی و تزکیہ کے محتاج ہوتے ہیں ۔ پھر زنگ و کثافت کی بھی مختلف حالتیں اور مختلف مراتب ہیں ۔ کوئی آئینہ جلد صاف ہوجاتا ہے ' کوئی بہت دیر میں ' اور کسی کا زنگ اس درجہ تک پہنچ چکا ہوتا ہے کہ صاف ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہتی ۔ حضرت ابوبکر صدیق ' حضرت علی ' خدیجتہ الکبریٰ ' سلمان فارسی اور ابو ذر رضی اللہ عنہم کے آئینہ مجّلی و مصفّی نے کس طرح اول نظر ہی میں عکس قبول کرلیا تھا ؟ یہ صدیقیت تھی جو جمال نبوت دیکھتے ہی پکار اٹھی : واللہ ما ھذا بوجہ کذاب ۔ مولانا نے اسی مقام کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ لیکن بہتوں کا آئینہ مکدر تھا اور کچھ عرصے تک صاف ہوتے رہنے کی ضرورت تھی ۔ کسی کو تھوڑا ' کسی کو زیادہ ' کسی کو بہت زیادہ وقت لگااور پھر کسی کے آئینہ استعداد کے زنگ و تکدر کا یہ حال تھا کہ چودہ برس کے متصل جلاء و صفائی سے بھی صاف نہ ہوسکا اور آئینہ کی جگہ پتھر اور لوہے کے حکم میں داخل ہوگیا ۔ " (ص111-112)

"تذکرہ" میں عزم رکھنے والی شخصیتوں سے متعلق مولانا ایک مقام پر فرماتے ہیں :

" ستاروں سے تمام فضائے سماوی بھری پڑی ہے ' لیکن دمدار ستارے ہمیشہ طلوع نہیں ہوتے ' یہی حال اصحابِ عزائم کا

بھی ہے ۔ وہ کائنات ہستی کا ایک بالکل الگ گوشہ ہے اور وہاں کے احکام و قوانین کو دنیا کے اعمالِ عادیہ پر قیاس کرنا غلطی ہے ۔ اُن کی قوتیں الہی ' اُن کے وسائل غیر مختتم 'ان کی ترقیاں لازوال اور اُن کے تمام طریقے غیر مختتم ہوتے ہیں ۔ " (ص273)

مولانا آزاد کی معرکتہ الآرا تصنیف '' غبار خاطر'' میں ان کی سائنس فہمی اور سائنسی ادراک کی تفصیلات کا احاطہ زیر نظر کتاب کے باب'' غبار خاطر' سائنس کے تناظر میں'' مفصل طور پر کیا گیا ہے۔ ایک خط میں انہوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں بخارا پر روسیوں کے محاصرے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے جنگ میں آتش فشانی کی تکنیک سے متعلق ابن فضل اللہ اور نویری کے حوالے سے جو تحریر کیا ہے اس میں چند سائنسی اصطلاحات پر بھی روشنی ڈالی ہے:

" آتش فشانی کے لئے دو طرح کی مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں ' ایک تو منجنیق کی قسم کی تھی ' جو پتھروں کے پھینکنے کے لئے ایجاد ہوئی تھی ' دوسری ایک طرح کا آلہ کمان کی شکل کا تھا اور توپ کی بیڑیوں کی طرح زمین میں نصب کردیا جاتا تھا ۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ دور تک پہنچی تھی ۔ ژو این ویل نے پہلے کو **Petrary** اور دوسرے کو **Swivel Cross Bow** سے موسوم کیا ہے ۔ " منجنیق " کا لفظ اسی یونانی لفظ کی تعریف ہے جس سے انگریزی کا **Mechanic** فرانسیسی کا **Mechanicus** اور جرمن کا **Mechanikus** نکلا ہے ۔ یہ آلہ عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لیا تھا ' لیکن دوسرا خود عربوں کی ایجاد ہے ۔ چنانچہ اُسے عربی میں " مدفع " کہتے تھے ۔ یعنی پھینکنے والا آلہ ۔ یہی "مدفع " بعد کو توپ کے لئے بولا جانے لگا ۔ عربی میں مٹی کے تیل کے لئے " نفط " کا لفظ مستعمل ہوا ۔ یہی " نفط" ہے جس نے یورپ کی زبانوں میں **Naphtha** اور **Napthlene** وغیرہ کی شکل اختیار کرلی ۔" (ص149-150)

مولانا آزاد نے اردو پڑھنے والوں کو سائنسی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اور انہیں سائنسی تحقیقات سے آگاہ کرنے کی خاطر اچھوتے اور نت نئے موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے اور اپنے دور کے سب ہی اخبارات اور رسائل میں انہیں شائع کروایا۔ سب سے پہلا مضمون انہوں نے ''ایکس ریز'' پر ''ضوٗ غیر مرئی'' کے عنوان کے تحت لکھا تھا جو'' خدنگ نظر'' کے دو شماروں مئی اور جولائی 1902ء میں بالاقساط شائع ہوا۔ جب کہ'' ایکس ریز'' کو ایک جرمن سائنس داں رونجن نے 1895ء میں دریافت کیا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق'' ایکس ریز'' پر اردو میں لکھا جانے والا یہ پہلا مضمون ہے۔ اس طرح سائنسی موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ 1927ء تک جاری رہا۔ اور یہ مضامین'' الندوہ'' ' ''لسان الصدق'' ' ''الہلال'' (دونوں دور کے) اور'' البلاغ'' جیسے موقر اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے۔

اردو کے قارئین کو سائنسی مضامین کے پڑھنے میں اکثر یہ دقت پیش آتی ہے کہ یا تو وہ ان کی سمجھ سے باہر ہوتے ہیں یا اتنے خشک ہوتے ہیں کہ قارئین جیسے ہی ان مضامین پر نظر ڈالتے ہیں تو فوراً صفحات الٹ دیتے ہیں۔ اگر کوئی قاری کسی مضمون کے عنوان سے متاثر ہو کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو ایک یا دو پیراگراف پڑھنے کے بعد ہی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس بارے میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ سائنسی موضوعات پر لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کی ہوتی ہے کہ جو کسی انگریزی ماخذ سے راست مواد لے لیتے ہیں اور ترجمہ کر دیتے ہیں۔ سائنسی علوم سے ناواقفیت انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ متن میں خود سے کچھ اضافہ کر سکیں اور مضمون کو عام فہم بنا سکیں۔ اسی بنا پر سائنسی موضوعات پر لکھے گئے اکثر مضامین قارئین کے لئے خشک اور سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ بہر کیف مولانا آزاد کے لکھے گئے سائنسی مضامین کی حیثیت استثنائی ہے۔ سائنس کے تمام شعبوں پر مولانا کی نظر تھی اور ان میں سائنسی علوم کا ادراک تھا۔ ادراک بھی ایسا کہ سائنس کے جس کسی موضوع پر وہ رقم طراز ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس شعبہ کے ماہر ہیں۔ مضمون لکھنے کے لئے مواد تو وہ بھی کسی نہ کسی انگریزی ماخذ سے لیتے تھے لیکن سب سے پہلے اس موضوع پر تمہید باندھتے اور مضمون کے متن میں حسب ضرورت مثالوں' احادیث اور قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتے اور اپنے فہم و ادراک سے اور خوبصورت طرز تحریر سے اس کو اتنا سہل بنا دیتے تھے کہ پڑھنے والا شروع سے آخر تک پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ اتنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ آسانی سے سمجھ میں نہ آنے

والے سائنسی اصولوں کی وضاحت کو، سائنس کی انگریزی اصطلاحات کی تشریح کو اور اردو میں ان اصطلاحات کے متبادلات کو اکثر اوقات مضمون کے فٹ نوٹ میں بیان کردیتے تھے۔

مولانا آزاد نے اردو اور عربی میں سائنسی علوم کی جو کتابیں جمع کی تھیں ان میں سے ایک بڑی تعداد آخر وقت ان کے پاس برقرار نہ رہ سکی۔ قلمی نسخوں اور کاغذات کے ساتھ یہ کتابیں بھی انگریزوں نے ضبط کرلیں۔ اس کے باوجود چند متعدد سائنس کی کتابیں ان کی پرسنل لائبریری میں موجود تھیں۔

ذیل میں مختلف سائنسی علوم پر مشتمل اردو کی ان کتابوں کی فہرست معہ تفصیلات دی گئی ہیں۔ جو مولانا آزاد کی پرسنل لائبریری میں موجود تھیں اور اس وقت وہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی لائبریری، آزاد بھون، نئی دہلی کے گوشہ آزاد میں دیگر علوم اور اصناف سخن کی کتابوں کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔ اس فہرست میں سائنسی علوم کی عربی کتابیں شامل نہیں ہیں:

1) " زینت الخیل "

306 صفحات پر مشتمل اردو نستعلیق میں 1257 ہجری میں لکھا گیا ایک مخطوطہ، جس پر مصنف کا نام نہیں ہے۔ اس کے متعلق یہ تحریر کیا گیا ہے کہ یہ اردو زبان کا ایک نایاب اور غیر مطبوعہ مخطوطہ ہے۔ مصنف نے اس میں مختلف قسم کے گھوڑوں، ان کی بیماریوں اور علاج کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس میں تمام قسم کے گھوڑوں کی ہاتھ سے پینٹ کی گئی رنگین تصویریں اصلی حالت میں شامل ہیں۔

2) "مقاصد علوم "

جسے لارڈ بروہم صدر صدور دارالسلطنت لندن نے تصنیف کیا ہے

A TREATISE ON THE
OBJECTS, ADVANTAGES AND PLEASURE OF SCIENCE
BY
LORD BROUGHAM
TRANSLATED INTO URDU BY
SYED MOHOMED MEER
A NATIVE OF LUCKNOW
CULCUTTA - 1847 A.D

نوٹ : اس کتاب کی تفصیلات ''آزاد کی کہانی' خود ان کی زبانی'' میں اس طرح ملتی ہیں:

" رسالہ مقاصد العلوم ' لارڈ بروہم کی کتاب کا ترجمہ ہے ' اور اس وقت کہا گیا ہے جب کہ لارڈ بروہم نے نئی نئی اپنی کتاب لندن میں چھاپی ہے۔ ترجمہ مرزا محمد حسین نے کیا ہے ' جو میرے خیال میں نئے علوم کے اولین ہندوستانی داعی ہیں اور جن کا ذکر سیر المتاخرین نے بھی کیا ہے۔ نواب سعادت علی خان نے انہیں لندن بھی بھیجا تھا۔ اس وقت کوئی مسلمان اس سفارت کے لیے نہیں ملتا تھا ' جسے تحائف کے ساتھ وہ اپنی نئی اسکیموں کی کامیابی کے لئے اور ڈائرکٹروں سے براہ راست ' علی رغم گورنر تعلقات پیدا کرنے کے لئے بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن مرزا محمد حسین ' کلکتے سے گیے اور کام کے لئے تیار ہوگئے ' وہاں انہوں نے نئے علوم کا بھی مطالعہ کیا۔ لارڈ بروہم کے لکچر سنے۔ سٹی کالج میں یہ لکچر ہوئے تھے ' جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔ لارڈ موصوف نے پال کلب میں انہیں مدعو بھی کیا ' جو لندن کا سب سے بڑا علمی اور معزز کلب ہے اور بجز اکابر عصر کے اور کوئی اس کا ممبر نہیں ہوسکتا۔ سر سید جیسا کہ انہوں نے سفر نامے میں لکھا ہے ' بڑی کوشش کے بعد وہاں جاسکے تھے۔ "

(3 معین الجراحین

اس رسالے میں انسان کے بدن کی ٹھٹھری کی ہر ایک ہڈی الگ الگ تصویر سمیت تشریح اور عضلہ' شریان' نس وغیرہ کا بیان سلیس اردو زبان میں ہندوستانی طلبہ کے سمجھنے کے لئے کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرڈرک جان مویٹ صاحب

نے کلکتے کے مدرسۂ عالیہ کے سابق متعلم منشی نصیر الدین احمد کی اعانت اور گرانٹ صاحب کی نقش طرازی سے مرتب اور ترجمہ فرما کر نام اس کا معین الجراحین رکھا اور کلکتے کے مطبع بشپ کالج میں طبع کروایا

سنہ 1866ء ماہ جنوری

4) **الادویہ مخزن**

1308 ہجری

ہومیو پیتھک طریقہ علاج پر اردو میں ایک عمدہ اور جامع کتاب مولفہ ڈاکٹر ملک صفدر حسین۔ اس کتاب کو بابو موہن چندر گھوش نے مراد پریس بانکی پور میں طبع کر کے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

5) **سلسلہ تعلیم پنجاب**

علم کیمیا کا ابتدائی رسالہ

جو سررشتہ تعلیم پنجاب کے صاحب ڈائرکٹر بہادر کے حکم سے مڈل اسکولوں کے واسطے مقرر ہے

مرتبہ پروفیسر راسکو

سررشتہ تعلیم پنجاب و ٹیکسٹ بک کمیٹی پنجاب کے لیے

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے اپنے مطبع مفید عام لاہور میں طبع کیا

1900ء

6) **مسلمانوں کے علوم طبیعہ کی تاریخ**

مولفہ خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ فیلو الہ آباد یونیورسٹی

سابق پروفیسر ورنی کیولر سائنس اینڈ لٹریچر میور سنٹرل کالج، الہ آباد

1900ء

مطبع احمدی دہلی میں باہتمام سید احمد طبع ہوئی

7) **علوم طبیعہ مشرقی کی ابجد**

مولفہ خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ فیلو الہ آباد یونیورسٹی

سابق پروفیسر ورنی کیولر سائنس اینڈ لٹریچر میور سنٹرل کالج، الہ آباد

1900ء

مطبع احمدی دہلی میں باہتمام سید احمد طبع ہوئی

8) **عربی شرقی طبیعیات کے ابجدوں پر محاکمات**

مولفہ خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ فیلو الہ آباد یونیورسٹی

سابق پروفیسر ورنی کیولر سائنس اینڈ لٹریچر میور سنٹرل کالج' الہ آباد

1900 ء

مطبع احمدی دہلی میں باہتمام سید احمد طبع ہوئی

9) سلسلہ کتب معاون تعلیم پنجاب 'نوترمیم

خلاصہ علم طبیعیات مع قوائے آلیہ بطور سوال و جواب

مع سوالات امتحانات مڈل از 1880ء تا 1900ء

جس کو مرزا رحمت علی صاحب' سائنس ماسٹر اسلامیہ اسکول لاہور نے

شیخ غلام علی منیجر بک ڈپو کشمیری بازار لاہور کی فرمائش پر مڈل اسکول کے طالب علموں کے لئے تیار کیا اور

رفاہ عام پریس لاہور میں چھپوایا

10) **علوم طبعیہ کی تاریخ**

مولفہ خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ فیلو' الہ آباد یونیورسٹی

سابق پروفیسر ورنی کیولر سائنس اینڈ لٹریچر میور سنٹرل کالج' الہ آباد

1900 ء

مطبع احمدی دہلی میں باہتمام سید احمد طبع ہوئی

11) **رہنمائے تشخیص**

جسے طلبائے ہاسپٹل اسٹنٹ کلاس۔ ہاسپٹل اسسٹنٹوں اور حکیموں کے فائدے کے واسطے

میر ہدایت اللہ 'ایل۔ایم۔ایس۔اسسٹنٹ سرجن

نے 1902ء میں تالیف کیا

بحسن اہتمام مولوی سید ممتاز علی صاحب مالک مطبع

رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوئی

(12 **نوشتۂ تقدیر**

یعنی انسانی قسمت کا فیصلہ

علم رمل پر انگریزی میں لکھی ایک مشہور کتاب کا ترجمہ ہے اور جس میں حکیم فیثا غورث کے

تیس سوالات زندگی معہ نو سو جوابات درج ہیں

کارخانہ پیسہ اخبار میں اردو میں ترجمہ کی گئی

منشی عبدالعزیز نے اسے 1902 میں تیسری مرتبہ

کارخانہ پیسہ اخبار کے مطبع خادم التعلیم پنجاب لاہور میں بڑے اہتمام سے طبع کیا

(13 **علوم طبعیه کی تاریخ (حصه دوم)**

انیسویں صدی کے علوم طبعیہ باتصویر

جس میں سیاروں وستاروں کے حالات و دریافتیں۔تعرض وتموج وانحلال النور۔روشنی کا رنگ و رفتار۔فوٹوگرافی۔حرارت وقوت کے مسائل۔بجلی۔مقناطیس وحرارت کا تعلق و مسائل۔آفتاب کے داغ۔گیس کے ذرات اور ان کی تحلیل۔تجزیہ کہربائیہ۔کیمیاوی نسبت واجزاو مرکبات۔کیمیائے وعلم حیوانات ونباتات۔نباتات کی تبدیلی صورت وتولید۔علم ہیولے۔مسائل علم الارض وعلم ترکیب حجریات۔مسئلہ انتخاب طبعی وغیرہ جیسی اہم ومفید باتوں اور سر جان ہرشل۔سر ولیم ہرشل۔سر ہمفرے ڈیوی۔سر ہوکر۔کاونٹ رمفرڈ۔نیوٹن۔اورسٹیڈ۔ایمپیر۔فریڈے۔سیبک۔ہرشوابی۔لیمارک۔کیئو ویٹر۔ہلیری۔ڈارون وغیرہ جیسے یکتائے زمانہ سائنس دانوں کی ایجادات اور تجربات درج ہیں۔

پنجاب ریلجس بک سوسائٹی (لاہور)

1905ء

(14 **القانون فی علاج الطاعون**

مولفہ حکیم مولوی میاں محمد صاحب انصاری مقیم کیمپ میرٹھ

اگست 1905ء

مولوی حافظ محمد عبدالاحد صاحب کے مطبع مجتبائی واقع دہلی میں طبع ہوا

15) **پانی**

جس کو بابو نہال سنگھ بھار گو منیجر کارخانہ نمک سلیمانی واقع محلہ گائے گھاٹ شہر بنارس نے تصنیف اور تالیف کیا اور سلیمانی پریس بنارس محلہ گائے گھاٹ میں چھپکر شائع ہوئی

مارچ 1906

16) **مضاد الفساد**

یعنی سائنٹفک طریقوں سے طہارت حاصل کرنا، کس طرح بیماروں کو جراثیم سے بچانا چاہیے، جراحی میں صفائی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے، عفونت وغیرہ کن طریقوں سے دفع کی جاسکتی ہے۔ یہ سب باتیں اس کتاب کا موضوع ہیں، اردو میں اس وقت تک ایسی کوئی اور کتاب موجود نہیں تھی۔ اس کتاب کو مولانا مولوی محمد عمر صاحب جذب لکھنوی نے تصنیف کیا اور حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور نے خلق اللہ کے فائدہ کے لئے

1907ء

مطبع خیر خواہ ریاستہائے ہند لاہور میں چھپوایا

17) **علاج نسوان**

اس کتاب میں عورتوں کے تمام امراض مخصوصہ کے مجرب علاج درج کئے گئے ہیں جسے کارخانہ پیسہ اخبار لاہور نے رفاہ عام کی خاطر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا

اور پہلی مرتبہ 1909ء میں

کارخانہ پیسہ اخبار کے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں بابو نظام الدین کے زیر اہتمام طبع کیا

18) **معرکۂ مذہب و سائنس**

ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر ایم اے۔ یل یل ڈی

کی شہرہ آفاق تصنیف کانفلکٹ بٹوین رلیجن اینڈ سائنس کا اردو ترجمہ و مرتبہ

ظفر علی خان بی۔ اے (علیگ)

حسب ایمائے انجمن اردو حیدر آباد دکن

مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور۔ 1910ء

19) **ہم گوشت کھائیں یا نباتات**

جناب ڈاکٹر نعمہ اللہ آفندی ایلیا۔ سول سرجن ۔ شفا خانہ ٔ منصور (ملک مصر) کے عربی رسالہ "ہل نذبح لناکل؟ کلا" (کیا ہم جانوروں کو اپنے کھانے کے واسطے ذبح کریں؟ ہرگز نہیں) کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ جس کو خاکسار محمد حلیم انصاری ردولوی نے حسب فرمائش کارخانہ پیسہ اخبار عربی رسالہ "الہلال" کے متفرق نمبروں سے عوام کو نفع پہنچانے کے لئے اردو میں ترجمہ کیا۔

1911 ء

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں بابو نظام الدین پرنٹر کے زیر اہتمام چھپ کر شائع ہوئی

20) **مکنیسر لیباریٹری**

اس کے فرائض اور تیار کردہ ادویات کے حالات

مرتبہ میجر جے۔ڈی۔ای۔ھوم صاحب بہادر ایم۔ڈی۔ایس۔سی

امپریل بیکٹر یالوجسٹ

مترجمہ منشی محمد عظیم الشان خاں بریلوی

کلکتہ سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پرنٹنگ انڈیا۔1914 ء

21) **سلسلہ انجمن ترقی اردو نمبر 25**

رسالہ علم نباتات

مولفہ محمد یوسف صدیقی' ایم۔بی۔او۔آر۔ایس

باہتمام نظام الدین حسین نظامی' نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا

1919ء

22) **رسالہ علم کیمیا ۔**

مولفہ میر اشرفی علی

23) ادنیٰ اپرنٹس سے لے کر بڑے سے بڑے مستری کے لیے کار آمد ہے

بجلی کی دوسری کتاب

یعنی وائرنگ کی مکمل کتاب، جس میں ہر قسم کی وائرنگ کا طریقہ درج ہے

مصنفہ ومولفہ: محمد سمیع اللہ

مطبوعہ کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس واقع گوالمنڈی، لاہور

24) سلسلہ نصاب تعلیم جامعہ عثمانیہ

طبیعیات عملی

مقناطیسیت وبرقی

ترجمہ ٹکسٹ بک آف پراکٹیکل فزکس

مصنفہ ایچ۔ ایس۔ ایلن وایچ مور لکچراران کنگز کالج

(لندن یونیورسٹی)

مع ترمیم واضافہ برائے بی۔ اے

مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب، بی۔ ایس سی آنرز (لندن)

اسوشیٹ آف دی رائل کالج آف سائنس (لندن) فیلو آف فزیکل سوسائٹی آف لندن

پروفیسر فزکس (طبیعیات) نظام کالج

1922ء

دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدرآباد دکن

25) سلسلہ نصاب تعلیم جامعہ عثمانیہ

عملی طبیعیات

خواصِ مادہ۔ حرارت (برائے بی۔ اے)

مصنفہ: ایچ۔ ایس۔ ایلن، ایم۔ اے ڈی۔ ایس۔ سی

اور ایچ مور، اے۔ آر۔ سی۔ آیس۔ سی۔ ڈی۔ ایس سی

مترجمہ مولوی وحیدالرحمٰن صاحب بی۔ایس سی
پروفیسر طبیعیات کلیہ جامعہ عثمانیہ
1931ء
دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباددکن

(26 سلسلہ نصاب تعلیم جامعہ عثمانیہ

نصاب ذیلی ریاضی

برائے طبیعیات بی۔ایس۔سی
تالیف مولوی محمد عبدالرحمٰن خان، بی ایس سی آنرز (لندن)
سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ
1936ء

(27 **نیا آسان الجبرا**

از پروفیسر کالی پد باسو ایم۔اے سابق پروفیسر ریاضی ڈھاکہ کالج
کے۔پی باسو لائبریری کلکتہ

(28 **البیان کامل فی تحقیق الدق والسل**

یعنی وہ کتاب جس میں دق کی تاریخ اس کے اسباب وعلامات اس سے بچنے کے طریقے اور علاج
نہایت شرح وبسط کے ساتھ درج ہیں
مصنفہ ڈاکٹر محمد عمر، اسسٹنٹ سرجن وماہر اکس ریز (لاشعاعیں)
متعینہ کنگ جارج میڈیکل کالج، لکھنو
باہتمام حکیم برہم مطبوعہ مطبع حکیم برہم گورکھپور

29) درین زماں سعادت مقرون رسالہ

السر المخزون فی تحقیق الطاعون

از خان بہادر حکیم مرزا نظیر حسن خان

سپرنڈنٹ شفاخانہ شاہی عم فیضہ بحسن اہتمام و تصحیح

جناب حذاقت انتساب فضیلت مآب جلیل المناقب محمود الغرائب

حکیم سید احمد عرف جناب تہو صاحب طبیب شفاخانہ دام مجدہ الراجب

در مطبع انوار محمدی لکھنو محمد تیغ بہادر مطبوع گردید

30) **طبی حشریات**

مولفہ : سید غوث، یم بی ۔ بی ۔ ایس، بی ۔ ایس سی (مدراس)

میڈیکل آفیسر آف ہیلتھ، مدر آباد چھاؤنی، سابق ہلتھ آفسر حکومت مدراس

مطبوعہ تاج پریس یوسف بازار، حیدر آباد دکن

31) **انٹم بم**

مولفہ نقاش سیرت محمد احمد اللہ خاں منصور حیدر آبادی

32) **جدید ڈاکٹری**

کتاب العلاج

یا ہینڈ بک آف میڈیکل ٹریٹمینٹ

از قلم ڈاکٹر بشرالدین عصری

ایڈیشن 1954ء

کامیاب انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن میرٹھ شہر

33) **جلدی امراض کا علاج**

Pocket Dermatography

از ڈاکٹر بشیر الدین عصری

1954ء

کامیاب انسٹی ٹیوٹ آف مڈیسن شہر میرٹھ

34) **رسالہ جراثیم اور طب قدیم**

از کبیر الدین

ناشر : دفتر المسیح، بازار نور الامراء حیدر آباد دکن

مطبوعہ: اسلام پریس، بازار نور الامراء حیدر آباد دکن

مولانا آزاد کا سائنسی شعور
صحافت کے آئینہ میں

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا تقریباً ربع صدی حصہ صحافت کی نظر ہوا۔ انھوں نے سب سے پہلے 1899ء میں کلکتہ سے ماہنامہ ''نیرنگ عالم'' جاری کیا جو ایک شعری گلدستہ تھا لیکن آٹھ شمارے نکلنے کے بعد وہ بند ہوگیا۔ پھر انہوں نے جنوری 1901ء میں ہفتہ وار ''المصباح'' جاری کیا۔ وہ بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ لکھنؤ سے نوبت رائے نظر کی زیر ادارت نکلنے والے ماہنامہ ''خدنگ نظر'' کے لئے انہوں نے 1903ء میں معاون مدیر کی ذمہ داری سنبھالی۔ اسی سال شاہجہاں پور کے اخبار ''ایڈورڈ گزٹ'' کی ادارت قبول کی۔ 1903ء کے آخر میں اپنا ایک رسالہ ماہنامہ ''لسان الصدق'' جاری کیا۔ اکتوبر 1905ء سے مارچ 1906ء تک ماہنامہ ''الندوہ'' لکھنؤ کے لئے معاون مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اپریل 1906ء میں سہ روزہ ''وکیل'' امرتسر کی ادارت قبول کی لیکن نومبر 1906ء میں بڑے بھائی ابوالنصر آہ کی وفات کی بنا پر اس سے علحدگی اختیار کی اور کلکتہ لوٹ گئے۔ جنوری 1907ء میں ہفتہ وار ''دارالسلطنت'' کلکتہ کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ پھر اس ہفتہ وار کو چھوڑ کر ستمبر 1907ء میں ''وکیل'' سے دوبارہ منسلک ہوگئے۔ اگست 1908ء میں والد کی شدید علالت کی وجہ سے ''وکیل'' کی ادارت سے مستعفی ہوگئے۔ جولائی 1913ء میں ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کیا جو اردو صحافت میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ نومبر 1914ء میں پہلے ہی سے طلب کردہ دو ہزار روپے کی ضمانت کی ضبطی اور مزید دس ہزار روپے کی ضمانت کی طلبی پر مولانا آزاد نے ''الہلال'' کو خود ہی بند کردیا۔ نومبر 1915ء میں ہفتہ وار ''البلاغ'' نکالا جو ہر لحاظ سے ''الہلال'' کی ہوبہو نقل تھا۔ مولانا آزاد کے صوبہ بدر کردیئے جانے پر اپریل 1916ء میں اس کو بھی بند کردینا پڑا اور وہ قیام کے لئے رانچی روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد 1927ء تک تحریک آزادی اور سیاسی جھمیلوں میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ صحافتی امور سے انہیں بالکل بے تعلق

ہو جانا پڑا۔ البتہ بہت ہی قلیل عرصہ کے لئے ہفتہ وار '' الہلال '' کو دوبارہ جون 1927ء میں جاری کیا اور دسمبر 1927ء میں چند اشاعتوں کے بعد بند کردینا پڑا۔ اس طرح مولانا نے 1899ء میں جو اپنا صحافتی سفر شروع کیا تھا وہ 1927ء میں اختتام کو پہنچا۔

مولانا آزاد جن دنوں ہفتہ وار '' المصباح '' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے' اس وقت ان کی عمر صرف بارہ برس تھی۔ اس اخبار میں علمی مضامین، تاریخ اور سوانح شائع ہوتے تھے اور اس میں مدیر کے قلم سے امام غزالیؒ کے علاوہ نیوٹن اور کشش ثقل جیسے جدید علوم کے موضوعات پر مضامین شائع ہوئے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا کو ابتدا ہی سے سائنسی علوم کے فروغ میں کس حد تک دلچسپی تھی۔ حکیم محمد علی کی ادارت میں ہردوئی سے ایک ماہنامہ '' مرقع عالم '' شائع ہوا کرتا تھا جس میں علمی، ادبی اور سائنسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ ایک معیاری رسالہ تھا جس کی کتابت وطباعت نہایت نفیس ہوتی تھی۔ اس کے لکھنے والوں کی فہرست میں ابوالکلام محی الدین آزاد دہلوی مقیم کلکتہ کا نام بھی شامل رہتا تھا۔ مولانا کا ایک خط اس رسالہ میں شائع ہوا تھا جس کے چند جملوں سے ان کے سائنسی شعور کا اظہار ہوتا ہے:

> '' اس عریضہ کے ہمراہ ایک مضمون '' علوم جدیدہ اور اسلام '' کے عنوان سے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ اسے '' مرقع '' میں شامل کیجیے۔ ...... میں نے اس خیال سے کہ جب '' مرقع عالم '' میں سائنس کے تراجم شائع ہورہے ہیں تو ان کی خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ یہ مضمون ''علوم جدیدہ اور اسلام '' آپ کے پرچہ کے لئے بھیجا ہے۔ ''

(خطوط ابوالکلام آزاد۔ ص 22-23)

سرسید احمد خان کی تصنیفات کے مطالعے نے مولانا آزاد کو جدید علوم سے روشناس کروایا اور ان کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ جب تک مسلمان، سائنسی علوم سے آگہی حاصل نہیں کرلیتے اس وقت تک وہ تعلیم یافتہ سماج کا حصہ نہیں بن سکتے۔ وہ اس بات کے لئے کوشاں رہتے اور دوسروں کو ترغیب دیتے کہ ترقی یافتہ زبانوں سے جدید علوم کو اردو کے قالب میں ڈھالیں۔ یہی وجہ رہی کہ سائنسی موضوعات پر وہ

کثرت سے لکھتے رہے اور انہیں شائع کرواتے رہے۔ جن اخبارات و رسائل سے وہ وابستہ رہے ان میں سائنسی علوم کو اردو میں منتقلی کی وکالت کرتے اور سائنسی موضوعات پر لکھی گئی تخلیقات کی اشاعت عمل میں لے آتے۔ غرض انہوں نے اپنے قارئین کو سائنسی علوم سے واقفیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ وہ رسائل جنہیں مولانا نے اس مقصد کے لئے استعمال کیا ان میں ''خدنگ نظر''، ''لسان الصدق''، ''الندوہ'' ''الہلال'' اور ''البلاغ'' خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

خدنگ نظر

نوبت رائے نظر کی زیر ادارت لکھنو سے ماہانہ ایک شعری گلدستہ ''خدنگ نظر'' 1897ء سے نکل رہا تھا۔ اس میں مختصر سا ایک نثری حصہ بھی ہوتا تھا۔ مولانا آزاد اس گلدستہ میں نہ صرف دلچسپی لیتے تھے بلکہ ان کے علاوہ ان کے بڑے بھائی ابو النصر آہ اور بہن فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو کے کلام شائع ہوا کرتے تھے۔ 1902ء میں اس گلدستہ میں نثری حصہ کو بڑھا دیا گیا تو اس میں مولانا آزاد اور ان کے بھائی کے دیگر موضوعات کے علاوہ سائنسی موضوعات پر بھی مضامین شائع ہونے لگے۔ 1903ء میں مولانا آزاد بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر، اس کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے اور اس کے نثری حصے کی ایڈیٹنگ کے فرائض انجام دینے لگے۔ ''خدنگ نظر'' کی مجلس ادارت میں انکی شمولیت کا تذکرہ عبدالرزاق ملیح آبادی کی روائت پر مبنی کتاب ''آزاد کی کہانی، خود ان کی زبانی'' میں کچھ اس طرح ملتا ہے:

> '' اسی زمانے میں لکھنو کے گلدستہ '' خدنگ نظر '' جو منشی نوبت رائے نظر، نواز گنج سے نکالتے تھے علاوہ غزلیات کے بہ تقلید مخزن مضامین کا ایک حصہ بھی شامل کیا گیا اور اس وقت کے اچھے اچھے مضمون نگار شرر، ڈاکٹر اقبال، منشی احمد علی مرحوم کاکوروی وغیرہ اس میں مضمون لکھنے لگے۔ اس میں بھی میں نے اور بھائی مرحوم نے خاص طورپر حصہ لیا اور بہ کثرت مضامین نظم و نثر اس میں شائع ہوتے رہے۔ سال بھر کے بعد جب خدنگ نظر میں نثر کا حصہ اور بڑھایا گیا تو اس حصہ کی ایڈیٹری بھی میرے متعلق کردی گئی اور اب زیادہ اہتمام اور پابندی

سے اس کے لئے مضامین مرتب کرنے لگا مولانا شبلی مرحوم نے اسی کے ایک مضمون کی بنا پر مجھے خط لکھا تھا جو عکس ریز یعنی ضئو غیر مرئی کی تاریخ ، انکشاف اور حقیقت پر لکھا تھا۔ "

(ص 280)

نامہ بری کے لئے کبوتر بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں ان کی نامہ بری کے تذکرے اور اشعار جابجا ملتے ہیں۔ سوال جواب کی صورت میں اس سے متعلق دو خوبصورت شعر ملاحظہ ہوں :

خط کبوتر کس طرح لیجائے بامِ یار پر پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

اور

خط کبوتر اس طرح لیجائے بامِ یار پر خط کا مضمون ہو پروں پر، پر کٹے دیوار پر

زمانہ قدیم میں جنگ اور امن کی دونوں ہی صورتوں میں کبوتر، مواصلات کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیلات سے نہ صرف سو سال قبل بلکہ آج بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔ مولانا آزاد نے اردو کے قارئین کو ان کی تفصیلات سے واقف کروانے کے لئے "زمانہ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک" کے زیرِ عنوان ایک طویل مضمون قلمبند کیا تھا جس کی پہلی قسط "خدنگ نظر" کے مئی 1902 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

"پچھلے زمانے میں جس حیرتناک طریقے سے جلد خبر کے پہونچ جانے کا ذریعہ پیدا کیا گیا تھا۔ واقعی بات یہ ہے کہ وہ ریل سے کہیں زیادہ تعجب خیز ہے کیونکہ ریل کی ایجاد کتنی ہی حیرت انگیز کیوں نہ ہو۔ مگر فی نفسہ ریل اس قابل نہیں ہے کہ اسے عقل تعجب کی نگاہ سے دیکھے۔ چند قوتوں کا اجتماع عجیب و غریب سرعت پیدا کرسکتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کرنے والی بات نہیں ہے۔ مگر ایک ایسی جاندار مخلوق جس میں نہ تو عقل ہو نہ فراست ہو نہ قوت ممیزہ ہو۔ ایسے ایسے کام کرے جو انسانی قواعد کے شایان ہیں نہایت ہی تعجب خیز امر ہے !!! اور اس کام کے دریافت کرنے والے کی عجیب و غریب اور حیرتناک فراست اور خداداد قوت عقلی ثابت ہوتی ہے۔

کسی ایسے زمانے میں کہ بظاہر کوئی سامان انتقال ذہنی کا نہ ہو۔ کسی ذہنی چیز کی ایجاد تعجب خیز ہے ۔ نہ کہ ایسے زمانے میں کہ اس کے سیکڑوں اسباب موجود ہوں اور ایجادات نے اس راستے کی داغ بیل ڈالدی ہو !!

جس حیوان کے ذریعے سے یہ انسانی کام لیا گیا تھا وہ ہمارے عربک لٹریچر میں انبیاء والطیر خطمآء الطیر ملائکۃ الملوک کے مقدس ناموں سے موسوم ہے اور عام زبانوں میں اسے "کبوتر" کہتے ہیں جس کی ظاہری صورت میں کوئی وجہ انتقال ذہنی کی نہیں پائی جاتی کیا کوئی شخص "کبوتر" کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سادی صورت میں اس قدر فراست کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے ؟ موجد کی اس لیاقت پر عش عش کرنا چاہیے "

کبوتر کی نامہ بری سے متعلق ہر ایک کے ذہن میں یہ سوال ضرور اٹھتے ہوں گے کہ اس مقصد کے لیے استعمال کئے جانے والے کبوتر کیسے ہوتے تھے؟ کیا ان کی نسل، شجرۂ نسب وغیرہ کا خیال رکھا جاتا تھا؟ کیا انہیں کسی خاص تربیت کی ضرورت ہوتی تھی؟ اس پر مولانا آزاد اپنے مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط جو جون 1902ء کے خدنگ نظر' میں شائع ہوئی تھی اس میں وہ ایک مقام پر یوں رقمطراز ہیں :

"............جن کبوتروں کے یہ کچھ اوصاف بیان کیے جاتے ہیں ان کے متعلق ہر ایک شخص غور میں ہوگا کہ وہ کیسے ہوں گے ؟ ان میں فطرتاً یہ اوصاف ہوں گے؟ یا انہیں سکھایا پڑھایا جاتا ہوگا ؟ آخر اس کی صورت کیا ہوگی ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کبوتر ویسے ہی کبوتر ہوں گے جیسے کہ آج کل شیرازی کبوتر ہوا کرتے ہیں ۔ یقینا ان کی صورت بھی ایسی ہی ہوگی (دیکھو فزیالوجی) مگر شہر موصل میں ایک .

قسم کے کبوتر ہوتے تھے۔ جن کانام وہاں کی اصطلاح میں مناسیب ہے۔ یہ کبوتر فطرتاً بہ نسبت اور کبوتروں کے انسان سے مانوس اور چالاک ہوتے ہیں۔ انہیں سے یہ کام لیا جاتا تھا۔

ان کبوتروں کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ خاص خاص نسل اور خاص خاص قسموں کے کبوتر انتخاب کیے جاتے تھے۔ الناصر الدین اللہ نے بغداد میں اور فاطمی خلفاء نے مصر میں جو محکمے قائم کیے تھے ان میں اس قسم کے لوگ خاص طور سے ملازم تھے جو کبوتروں کے اقسام سے واقف اور ان کے شجرۂ نسب کے حافظ تھے۔ خاص نسل کے عمدہ کبوتر ہزار ہزار دینار تک فروخت ہوتے تھے اور محکمہ انہیں بخوشی خرید اکرتا تھا۔

اس قسم کی کتابیں تالیف کی گئی تھیں جن میں ان کے نسب نامے انسانی انساب کی طرح مشجر لکھے جاتے تھے اور ان کے موافق ان کی غور و پرداخت کی جاتی تھی۔

اس کے بعد کبوتروں کو اڑا اڑا کر اور تعلیم یافتہ کبوتروں کے ہمراہ پھرا کر سکھایا جاتا تھا اور ان کی چالاک طبیعت فوراً سیکھ جاتی تھی۔"

جرمن ماہر طبیعیات رونجن نے 1895ء میں ایکس ریز (X-Rays) کی دریافت کی اور 1918ء میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد وہاں اس کے لئے اصطلاح ''لاشعاعیں'' تدوین کی گئی تھی۔ مولانا آزاد نے جب اس پر ایک طویل مضمون لکھا تو انہوں نے اس کے لئے اصطلاح ''ضؤ غیر مرئی'' تدوین کیا۔ چنانچہ ان کا مضمون 1903ء کے ''خدنگ نظر'' کے دو شماروں میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ مئی 1903ء میں شائع شدہ اس مضمون کی پہلی قسط پر ابوالکلام آزاد دہلوی اسسٹنٹ ایڈیٹر کلکتہ کے نام سے اس طرح کا ایک نوٹ شائع ہوا تھا:

"اس مضمون میں دراصل ہمیں اس غیر مرئی روشنی کا حال لکھنا ہے جسے پروفیسر رونتکین نے دریافت کیا اور جس

روشنی کے ذریعے سے مقفل صندوق اور انسان کے اندرونی جسم کی تمام کیفیت نظر آتی ہے ۔ اردو میں اس وقت بڑا نقص (جو تراجم علوم کا دروازہ روکے ہوئے ہے) یہ ہے کہ اصطلاحات علمی اور اسما کے لئے اکثر الفاظ اردو میں نہیں ملتے اور مجبوراً اصل انگریزی یا کسی اور زبان کے لفظ پر توجہ کرنی پڑتی ہے ۔ چنانچہ اس روشنی کا نام بھی اردو میں کوئی نہیں ہے اور شخصی کوشش قرار دے بھی نہیں سکتی ۔ مجبوراً ہم بجائے اصل انگریزی لفظ کے عربی لفظ (جس سے اردو اس قدر غیر مانوس نہیں ہے) یہاں لکھتے ہیں اور ہمارے نزدیک اور لفظوں سے 'ضؤ غیر مرئی ' بہت بہتر ہے ۔

(آزاد دہلوی)"

(حیات ابوالکلام آزاد، عبدالقوی دسنوی۔ ص163)

مضمون مذکورہ کی دوسری قسط تھوڑی تاخیر کے ساتھ جولائی 1903ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس قسط پر شائع کیا گیا نوٹ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

" اس مضمون کا یہ دوسرا نمبر کسی قدر دیر میں شائع ہوا ! ناظرین کو اشتیاق کے ساتھ انتظار کی تکلیف گوارہ کرنی بہت تکلیف دہ ہوئی ہوگی ، جس کی معافی چاہنا میرا فرض ہے ۔ پچھلا نمبر اصل موضوع کی تمہید تھا اور اس لئے اس میں کوئی دلچسپ بیان نہیں ہوسکا ۔ یہ نمبر جو شائع کیا جاتا ہے اصل موضوع کا بیان ہے اور امید ہے کہ قدردان ناظرین اس سے محظوظ ہوں گے ۔ اس قسم کے مضامین کا ابھی ہمارے ملک میں مذاق نہیں پیدا ہوا ہے ۔ ہمارے لٹریچر میں اس کی بڑی بھاری کمی ہے ۔ " خدنگ " کے صفحات پر آئندہ زیادہ تر اسی قسم کے مضامین کے شائع ہونے کی کوشش ہوگی جو دلچسپی کے ساتھ ہمارے معلومات کو وسیع کرتے رہیں ۔ (اسسٹنٹ ایڈیٹر)"

(حیات ابوالکلام آزاد' عبدالقوی دسنوی۔ ص164)

مولانا آزاد کو علم فلکیات سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے اس موضوع پر کئی مضامین تحریر کئے تھے جو 'الہلال' کے صفحات کی زینت بنے۔ یہاں تک کہ ماہر علم فلکیات و جغرافیہ البیرونی پر لکھا ہوا ان کا ایک طویل مخطوطہ بعنوان ''البیرونی اور جغرافیۂ عالم'' آزاد بھون، دہلی میں موجود ہے اسی مخطوطہ کو پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے سنہ 1980ء میں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ مولانا کی اس دلچسپی نے انہیں ترغیب دی کہ وہ فلکیات پر کوئی کتاب ترجمہ کریں۔ چنانچہ جون 1903ء کے ''خدنگ نظر'' کے شمارہ میں ان کی ترجمہ کردہ کتاب ''الہیئت'' کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ جس کا متن تھا :

'' الہئیت (جدید علم ہئیت کی ایک مکمل کتاب) ، جدید علم ہئیت میں آج تک کوئی ایسی اردو تصنیف شائع نہیں ہوئی جس میں اس علم کے ہر پہلو سے بحث کی گئی ہو اسی خیال سے میں نے ایک مفصل کتاب '' الہئیت '' نامی تالیف کی ہے (جو ممالک اسلامیہ کی ایک مستند کتاب سے ماخوذ ہے) اس کتاب کا پہلا حصہ الارض جس میں کرہٗ زمین کی پوری حالت اس کی قدرتی وضع ، گردش کے وجوہ ، کیفیتِ گردش ، جذب ، کشش ، انقلابِ شب و روز ، کسوف و خسوف رفتار روزانہ و سالانہ وغیرہ تمام بیانات کے علاوہ دیباچہ میں علم ہئیت کی تاریخ جدید تحقیقات کی کیفیت بعض موجدین علم ہئیت کی تصویریں ، دور بینوں کی مفصل حالت درج کی گئی ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ جابجا نظائرو مماثل کی غرض سے تصاویر اور نقشے بھی لگائے گئے ہیں ۔ یہ کتاب عنقریب شائع ہوگی ۔ جو صاحب قیمت قبل اشاعت ارسال فرمائیں گے ان سے عہ / ورنہ عہ ۸/ محصول ڈاک علاوہ ۔

المشتہر ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

کلکتہ ، تارا چند اسٹریٹ نمبر مکان ۱۲ ''

(حیات ابوالکلام آزاد، عبدالقوی دسنوی، ص 105-106)

کتاب ''آزاد کی کہانی، خود ان کی زبانی'' کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد اپنی زیر

اشاعت کتاب ''الھیت'' کے ترجمہ کی تکمیل نہیں کر پائے تھے جس کی بنا پر وہ شائع ہونے سے قاصر رہی:

" ہئیت جدیدہ کا ترجمہ : اسی زمانے (1903ء) میں مسیوکینول فلا ماریاں کے رسالے ، سولر سسٹم کا ترجمہ اردو میں کیا۔ دراصل یہ ایک فارسی ترجمے کا ترجمہ تھا ، جو عبدالرحیم تبریزی نے قسطنطنیہ میں "ہئیت جدیدہ " کے نام سے چھاپا تھا۔ اور سب سے زیادہ سہل ، عام فہم اور جامع رسالہ ہے جو اس باب میں عربی و فارسی میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر فاندیک کی " اصول الہئیتہ " مطبوعہ بیروت بھی پیش نظر تھی ' نیز " حدائق النجوم " سے بھی بعض مطالب کا اضافہ کیا اور اس کے مختلف ٹکڑے " خدنگ نظر " میں بھیجتا رہا ، لیکن بڑی دقت نقشوں اور ہاف ٹون تصویروں کے لئے پیش آئی۔ بلا ان کے کتاب کا فہم اور مشکل صور و اشکال کامعائنہ ممکن نہ تھا اور لیتھو میں وہ چھپ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ابھی نصف کے قریب ترجمہ ہوا تھا کہ طبیعت اچاٹ ہوگئی اور ناتمام رہ گیا۔ "

(ص258)

اس طرح مولانا آزاد نے بحثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر اور مضمون نگار '' خدنگ نظر'' کے قارئین کو سائنسی معلومات بہم پہنچائیں اور سائنسی ایجادوں اور دریافتوں سے انہیں روشناس کروایا۔

لسان الصدق

پندرہ سال کی عمر کو پہنچنے تک مولانا ابوالکلام آزاد کئی ایک کاموں کی تکمیل کر چکے تھے۔ درس نظامی سے فارغ ہو چکے تھے انگریزی زبان سیکھی اور علم طب سے جانکاری حاصل کی تھی۔ شعر کہتے اور انہیں گلدستوں میں چھپواتے تھے۔ '' نیرنگ عالم'' کے نام سے ایک گلدستہ ترتیب دے چکے تھے۔ '' خدنگ نظر'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور اس میں اپنے تحریر کردہ مضامین چھپوا چکے تھے۔ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ اور '' اعلان الحق'' کی تصنیف کی بدولت علمی دنیا میں ان کی شناخت بن چکی

تھی۔ شعر وادب کے پرچوں سے ان کے تعلق نے ان میں صحافت سے گہرا لگاؤ پیدا کر دیا تھا اور وہ اس بات کے متمنی تھے کہ خود ایک علمی، ادبی، تاریخی، معاشرتی اور سائنسی رسالہ اپنی ادارت میں نکال سکیں۔ اس خواہش کی تکمیل اس وقت ہوئی جب انہوں نے ''لسان الصدق'' کے نام سے ایک ماہنامہ 20 نومبر 1903ء کو کلکتہ سے جاری کیا۔ اس کے سرورق پر'' دارالسلطنت کلکتہ کا ماہوار رسالہ، ایڈیٹر ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی درج ہوتا تھا۔ اس عام علمی، اخلاقی، تاریخی، سائنٹفک مضامین کے چار مقصدوں پر مضامین شائع ہوتے ہیں (1) سوشیل ریفارم (2) ترقی اردو (3) تنقید (تصنیفوں اور اخباروں) (4) علمی مذاق کی اشاعت''۔

مولانا آزاد نے ''لسان الصدق'' کے شماروں میں اصلاح معاشرے کے لئے جہاں کھل کر لکھا تھا اور بے جا رسومات اور توہمات سے مسلمانوں کو چھٹکارہ دلانے کی کوشش کی تھی وہیں پر انہوں نے اردو کی ترقی کو ایک تحریک کے طور پر عمل میں لانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس موضوع پر نہ صرف انہوں نے متعدد شماروں میں خود لکھا بلکہ دوسرے نثر نگاروں کے مضامین کو بھی اس میں شائع کیا۔ یہاں تک کہ'' لسان الصدق'' کے اغراض و مقاصد میں دوسرا مقصد اردو کی ترقی کا رہا ہے۔ پہلے شمارے میں اس مقصد کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ'' کوئی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک اس میں جدید اور تکنیکی علوم پر لکھی گئی کتابیں شائع نہ کروائی جائیں۔'' صاف ظاہر ہے کہ سائنس کے احاطہ کے بغیر جدید اور تکنیکی علوم کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اس معاملہ میں وہ اردو زبان اور اس کی کتابوں کا دوسری مشرقی زبانوں عربی، فارسی اور ترکی سے تقابل کرتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ عربی اور ترکی زبانیں جدید علوم کو یورپی زبانوں سے جس تیزی سے اپنے میں سمو رہی تھیں اور مالا مال ہو رہی تھیں وہیں اردو زبان مخرب اخلاق ناولوں کی اشاعت کے انبار لگا رہی تھی۔ اسی مناسبت سے اس زبان کے پڑھنے والوں کا ذوق بھی نچلے درجہ کا ہوکر رہ گیا تھا۔ کتابوں کی اشاعت کے معاملہ میں مولانا آزاد کا یہ ماننا تھا کہ اردو زبان میں لکھی اور شائع کی جانے والی کتابیں کسی خاص مقصد اور منصوبے کے تحت نہیں لکھی جا رہی تھیں۔ اہل قلم وہی تحریر کر رہے تھے جس کی اردو والوں میں مانگ تھی۔ رسالوں کے مدیران اور پبلشرز انہی مضامین اور کتابوں کی اشاعت عمل میں لاتے تھے جن کی پذیرائی ہوتی۔ مولانا کا یہ ماننا تھا کہ دوسری تمام زبان والے جدید علوم کو دوسری ان زبانوں سے جن میں وہ دستیاب ہیں اپنی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ منتقل کر رہے ہیں۔

انھوں نے اس بات کی صلاح دی کہ وہی کام اردو کے نثر نگار، ادارے اور پبلشرز ایک پروگرام کے تحت روبہ عمل لائیں تا کہ اردو کی ترقی ہو سکے۔

مولانا آزاد، انجمن ترقی اردو کے قیام عمل میں لانے کو فال نیک قرار دیتے ہیں جس کو محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے لٹریری سکشن نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ اس بات کی امید کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ انجمن بہت جلد اردو میں جدید علوم کو منتقل کرتے ہوئے اس قومی زبان کو علمی زبانوں کے زمرے میں لا کھڑا کرے گی۔ انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ ''لسان الصدق'' کا جو دوسرا مقصد ہے وہ دراصل انجمن ترقی اردو کی ترقی ہی سے متعلق ہے۔ اس طرح مولانا نہ صرف انجمن ترقی اردو کے امور کو بڑھاوا دینے کے لئے اپنے رسالے میں لکھتے رہے بلکہ انجمن کی رہنمائی بھی کرتے رہے کہ وہ اردو کے فروغ کے لئے زیادہ سے زیادہ سائنسی کتابوں کی اشاعت پر توجہ دے۔ مولانا کی انجمن ترقی اردو کے کاموں میں اس درجہ دلچسپی کی وجہ سے نہ صرف انہیں مجلس عام میں شامل کیا گیا بلکہ ایک مخصوص عرصہ کے لئے اسسٹنٹ سکریٹری بھی بنایا گیا جب مولانا شبلی نعمانی اس کے سکریٹری تھے۔ مولانا آزاد نومبر 1903ء کے ''لسان الصدق'' میں انجمن ترقی اردو کے حوالے سے یہ تحریر کرتے ہیں کہ :

> '' انجمن ترقی اردو نے اردو زبان کے علمی دائرہ کو وسیع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہیکہ انگریزی ، عربی ، فارسی کی علمی اور فنی کتابیں شگفتہ اردو میں ترجمہ کرکے شائع کی جائیں، جن کی اشاعت سے قوم میں لغو اور بے نتیجہ ناولوں کے بجائے علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو ، چنانچہ انگریزی ، عربی ، فارسی کی جو کتابیں انجمن نے انتخاب کی تھیں ان کے ترجمہ اور طبع کا انتظام نہایت معقول طریقہ سے ہورہا ہے اور امیدہے کہ بہت جلد کتابیں طبع ہوکر ملک میں روشنی پھیلائیں گی ...... ''

اگست و ستمبر 1904ء کے ''لسان الصدق'' میں ایڈیٹر کے حوالے سے مولانا آزاد کا ایک مضمون بعنوان '' ترقی اردو اور تراجم علوم و فنون کا سلسلہ نمبر (1) '' شائع ہوا تھا۔ جس میں اردو زبان ایک علمی زبان کا درجہ کیوں کر حاصل کرسکتی ہے؟ جیسے سوال کا جواب تفصیل سے دیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے عربی اور دیگر

زبانوں کے حوالے سے یہ واضح کیا گیا کہ علمی زبان میں دو خصوصیات ضرور ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ ذاتی سرمایہ رکھتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس میں دوسری علمی زبانوں سے علوم بذریعہ تراجم منتقل ہوتے ہیں۔عربی زبان کی بابت کہ کس طرح وہ ماضی میں علمی زبان کے زمرے میں شامل ہوئی۔مولانا آزاد اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں :

" ...... عربی جو کسی زمانے میں بین السطور اور افلاطون کی تحقیقات سے فائدہ اٹھاتی تھی ۔ آج بیکن اور نیوٹن کے ایجادات سے مالا مال ہورہی ہے ، مصر اور قسطنطنیہ میں ابتدا سے تعلیم کے ساتھ تراجم کا سلسلہ قائم کیا گیا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اور ترکی میں علوم جدیدہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا سائنس کی کوئی شاخ بمشکل ایسی ملے گی جس میں کوئی کتاب عربی میں ترجمہ نہ کی گئی ہو ، شام کے عرب عیسائیوں نے اور بالخصوص بیروت کے " رومن کتھولک " عیسائیوں نے تراجم علوم کو عربی میں جو وسعت دی ہے ، اس کی نظیر اس وقت کسی شرقی زبان میں نہیں مل سکتی ، " ڈاکٹر کرنیلیکوس فاندیک جو شام کا ایک مشہور عربی مترجم اور مصنف تھا اور جسے انتقال کئے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ہے ، اس نے علاوہ اور سائنٹفک مضامین کے ایک ایسا عمدہ سلسلہ عربی میں مرتب کردیا ہے ، جس کے دیکھ لینے سے سائنس کے تمام شاخوں پر ایک اجمالی نظر ہوجاتی ہے ...... "

اگر اردو زبان کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کو ابتدا سے ایسا ماحول نہیں ملا کہ وہ سائنسی اور تکنیکی مواد کو اپنے میں سمو سکے اور علمی زبان کے زمرے میں شامل ہوسکے۔چنانچہ اس کے علمی زبان نہ بننے کی وجہ کیا ہے؟ اور وہ کیوں کر علمی زبانوں میں شامل ہوسکتی ہے۔اس کے بارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں :

" اردو زبان ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئی جب کہ اسلامی

علوم و فنون کی ترقی کا دور ختم ہوچکا تھا 'اور تنزل کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں تھیں ۔ اس نے ایک ایسی سوسائٹی میں پرورش پائی جو علوم و فنون سے بالکل بے خبر تھی اور اپنی بے بہا زندگی بے فکری اور لاابالی کی نذر کرچکی تھی ، آنکھ کھول کر اس نے جس کو دیکھا اسی حالت میں مست دیکھا ، سوسائٹی ہی کا یہ اثر تھا کہ اسے بچپن ہی سے عشق و محبت کی چاشنی پسند آگئی' اور اپنے شباب کا زمانہ اسی عشق و محبت کے جذبات میں صرف کردیا ، ہندوستان کی سلطنت میں جب انقلاب ہوا اور ایک متمدن قوم نے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی علمی زبان کا اردو پر بھی اثر پڑنے لگا یہ پہلا موقعہ تھا کہ اردو علمی صورت سے روشناس ہوئی ، اسی تمدنی اثر سے اخبارات جاری ہوئے ، کتابیں لکھی گئیں ۔ لوگوں کو جدید علوم کا شوق ہوا ، انگریزی سے کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں اوریجنل مضامین پر بھی علمی طریقہ سے کتابیں تصنیف کی گئیں ، غرض یہ کہ اردو جس گہری نیند میں سو رہی تھی ، اس سے ایک کروٹ لی ، زمانہ کی ضرورتوں سے واقف ہوئی اورآج تک کچھ نہ کچھ ترقی کرتی رہی

"لیکن درحقیقت نہ تو ان چند اخبارات سے یہ علمی زبان بن سکتی ہے اور نہ ان ترجموں سے جو متفرق طورپر شائع ہورہے ہیں' اردو زبان جب ہی ترقی کرسکتی ہے اور علمی زبان بن سکتی ہے جب کہ اس میں باضابطہ تراجم علوم و فنون کا سلسلہ قائم کیاجائے ، جدید علوم کے ہر صیغہ میں مبسوط اور جامع کتابیں ترجمہ کی جائیں ، علوم و فنون کا کوئی پہلو یورپ کی زبانوں میں ایسا نہ ہوجس کا اردو میں ترجمہ موجود نہ ہو ، جب تک اردو میں ایسا منظم سلسلہ قائم نہ ہوگا ۔ اس کی علمی ترقی محال ہے۔ "

''لسان الصدق 1905ء میں'' کے زیرعنوان اگست وستمبر 1904ء کے شمارے میں مولانا آزاد کا مضمون نما ایک اعلان شائع ہوا جس کو وہ رسالہ کی زندگی میں ایک انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں۔اور وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ پرچہ صوری اور معنوی اعتبار سے بالکل بدلا ہوا ہوگا۔ہوسکتا ہے کہ اس کے قارئین اس پرچہ کو نئے قالب میں دیکھ کر حیرت کا اظہار کریں گے۔کیوں کہ اس میں مذہبی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنسی مضامین بھی شامل رہیں گے۔

اپریل ومئی 1905ء کی اشاعت میں اس بات کا ظہار کیا گیا کہ''لسان الصدق''اب اپنی اصلی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کی اصلی زندگی ابھی سے شروع ہوتی ہے۔لیکن یہ رسالہ وہ''لسان الصدق''نہیں رہا ہے جس کو قارئین سال بھر تک معمولی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ''لسان الصدق''اس وقت ایک ایسے رسالے سے عبارت ہے جو کارآمد،ملک کے لئے مفید اور سائنٹفک مضامین کا ایک عمدہ مخزن ہے جس کے کارآمد اور مفید بنانے میں ہندوستانی کوشش کے تمام ممکن ذرائع سے کام لیا گیا ہے۔اس شمارے میں مولانا ایک مقام پر اس ارادے کا اعادہ کرتے ہیں کہ''لسان الصدق''کے آئندہ مضامین کے لئے تین علوم کا انتخاب کرلیا گیا ہے جن کی اشاعت رسالے کا اولین مقصد ہوگا۔ان میں سائنس،تاریخ اور اخلاق کا احاطہ کیا جائے گا۔

''لسان الصدق''کے شمارہ اپریل ومئی 1905ء میں''ترقی اردو نمبر 2 ،انجمن ترقی اردو''کے عنوان سے مولانا آزاد کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اردو ادب میں بے ہودہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور مصنفین کے اس رویے کی مذمت کی گئی کہ انہوں نے اپنا قلم پبلک کے مذاق کا تابع کر دیا،جس کے نتیجہ میں پبلک روز بروز اسی مذاق کی عادی ہوتی گئی۔مولانا نے ایک سرکاری رپورٹ کا حوالہ دیا جس کے مطابق 1901ء میں اردو کی 457 کتابیں شائع ہوئی تھیں جن میں 231 کتابیں بے ہودہ نظموں،ناولوں اور ادنی درجہ کے مضامین پر مشتمل تھیں اور تقریباً 100 کتابیں معمولی درجے کی تھیں۔جب کہ صرف 16 کتابیں تاریخ،ادب،سائنس اور صنعت وحرفت کی تھیں۔مولانا آزاد نے انجمن ترقی اردو کے زیراہتمام شائع کی جانے والی کتابوں کے لئے پیش آنے والی مشکلات کا اظہار کیا اور بتلایا کہ اگر انجمن پبلک کے مذاق کو بالائے طاق رکھ کر اعلیٰ قسم کی کتابیں شائع کرے تو ان کو خریدنے والے کہاں سے ملیں گے۔چنانچہ اپنے اشاعتی پروگرام کے معیار کو قائم کرنے کے لئے سب

سے پہلے انجمن کے پیش نظر پبلک کے ذوق کو معیاری بنانا ہوگا تبھی انجمن اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی۔ انجمن ترقی اردو کی ان مجبوریوں کے ساتھ ساتھ اس کی طبع کردہ کتابوں کی اشاعت پر مولانا اس طرح تنقید کرتے ہیں:

"...... انجمن ترقی اردو نے جس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور جن کے ترجمہ ہورہے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن نے کسی خاص صیغہ علمی کی اشد ضرورت تسلیم کرکے اس پر توجہ کرنے کی جگہ مختلف سلسلے جاری کردیے ہیں ، جن سے کام نہایت پریشان ہوگیا ہے ایجوکیشن 'ہے کارلائل ، رہنمائے ہند ، نامہ دانشوران' سولر سسٹم ، فلسفہ حسن ، ان چھ کتابوں میں ایک کتاب فن تعلیم سے تعلق رکھتی ہے ، ایک کتاب تاریخ کے ساتھ اخلاق پر مشتمل ہے ، دو کتابیں مختلف لوگوں کے حالات اور تاریخ کے متعلق ہیں ، سولر سسٹم علم ہئیت کا ابتدائی رسالہ ہے صرف آخری کتاب فلسفیانہ مضمون کی ہے ۔ بے شک !یہ کتابیں اعلیٰ درجہ کی ہیں اور ان کا ترجمہ اردو میں کبھی غیر مفید نہیں ہوسکتا ، لیکن اردو کی کم مائگی اور قوم کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہر صائب الرائے شخص یہی کہے گا کہ ابھی صرف سائنٹفک اور فلسفیانہ کتابوں کی اشد ضرورت ہے'ان تمام کتابوں میں صرف تین کتابیں ایجوکیشن ، سولر سسٹم ، فلسفہ حسن اسی قابل ہیں کہ ان کا ترجمہ اردو میں نہایت ضروری سمجھا جائے باقی کتابوں کی ترقی اردو کے لئے ابھی ایسی ضرورت نہ تھی کہ ان کو اور فلسفیانہ تصنیفات پر ترجیح دی جاتی ، ابھی ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ علم کس چیز کو کہتے ہیں ؟ سائنس کیا چیز ہے ؟ کس قدر وسیع ہے ؟ اور اس کی کتنی شاخیں ہیں ؟ دنیا نے اس سے کیا فائدے حاصل کئے ؟ اور ہم کیا حاصل کرسکتے ہیں ؟ انہیں کتابوں کی ہم کو ضرورت ہے، جو ہم کو ان امور کے سمجھنے میں مدد دیں ۔ اگر ہم

راہ نمایان ہند کے حالات سے واقف ہوگئے ، یا ایک بہت بڑی جماعت علماء و شعرا کے حالات معلوم ہوگئے تو وہ گو ہمارے لئے مفید ہوں لیکن ابھی وہ ہم کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچا سکتے جس قدر کہ سائنس اور فلسفہ سے ہم کو توقع ہے ، پس انجمن اردو کا کتابوں کو انتخاب کرتے ہوئے اسی نکتہ کو بھلا دینا ہمارے لئے نہایت مضر ہوگا ،اگر ایسی فاضل جماعت نے اس نکتہ پر توجہ نہیں کی تو پھر کس سے امید ہوسکتی ہے "

"لسان الصدق" کے مضامین میں اردو میں جدید علوم کی کتابوں کی اشاعت اور تعلیم کے ساتھ سائنس کو کس طرح اہمیت دی گئی تھی اس کے بارے میں سید مظفر حسین برنی اپنے مقالہ" مولانا آزاد کا مقام، ہندوستانی صحافت میں" میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :

" لسان الصدق کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کے مسئلہ پر آزاد کے خیالات نہایت ترقی پسند اور دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق تھے ان کی رائے میں تعلیم ہی معاشرتی اصلاح کی کلید ہے انہیں تعلیم یافتہ طبقہ میں سائنٹفک خیالات کی اشاعت کی بڑی فکر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں اردو اہم رول ادا کرے ۔ اسی لئے انہوں نے اردو میں سائنٹفک اور فلسفیانہ کتابوں خصوصاً بیکن ، نیوٹن اور ڈارون کی تصانیف کے ترجمے پر زور دیا ۔ ان کی خواہش تھی کہ قارئین میں جستجو کا مادہ پیدا ہو اور وہ انہیں اشیا کے بارے میں کیسے اور کیوں کا علم حاصل کرنے پر مائل کرنے کی کوشش کرتے تھے "

(مولانا آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت۔ رشید الدین خان۔ ص 262)

"لسان الصدق" کی اشاعت تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہی اور مئی 1905ء کا شمارہ آخری رہا۔ اس قلیل مدت میں بھی اس کی اشاعت وقفوں وقفوں سے ہوتی رہی۔ اس کے باوجود اس نے صحافتی دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس دور کے مشہور اخبارات میں اس پر بڑے اچھے تبصرے شائع ہوئے

۔اس کے معیار کی بلندی اور طرز تحریر کی دلکشی سے لوگوں نے مولانا آزاد کے بارے میں ایک معمر اور بہت ہی منجھے ہوئے مدیر کا تاثر لیا۔ چنانچہ مولانا کی عزت، شہرت اور مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا اور وہ اکثر علمی، ادبی جلسوں اور تہذیبی پروگراموں میں تقریر کے لئے بلائے جانے لگے۔ تقریر میں خطیبانہ لہجہ سامعین کو دم بخود کر دیتا اور انہیں بڑا تعجب ہوتا کہ اتنی کم عمری میں "لسان الصدق" جیسے موقر رسالہ کی ادارت کے فرائض وہ کیسے انجام دے پاتے ہیں۔

جون 1904ء کے "لسان الصدق" میں "دلچسپ معلومات" کالم کے تحت "فزکس کے متعلق، پانی قدرت الٰہی کا عجیب نمونہ ہے" شائع ہوا تھا۔ جس میں پانی کے اجزائے ترکیبی کی خصوصیات کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا:

> "آگ اور پانی کی دشمنی دنیا جہاں جانتی ہے لیکن پانی کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ اس کی پیدائش آگ سے ہوتی ہے یا صاف لفظوں میں "آگ نے پانی کو پیدا کیا ہے" ظاہر میں دیکھو تو پانی کے چار چھینٹے پڑے اور آگ بجھ گئی دونوں میں ایسی دشمنی نظر آتی ہے مگر دراصل پانی آگ ہی سے پیدا ہوتا ہے پانی دو عنصروں سے مرکب ہے آکسیجن اورہائیڈروجن جب یہ دونوں عنصر ایک اور آٹھ کے تسویہ سے ملتے ہیں تو ایک تیسری چیز پانی پیدا ہوجاتا ہے اب دیکھو! آگ کا اصلی عنصر آکسیجن ہے اور ہائیڈروجن بھی آتش صفت ہے جب دونو ں چیزیں ملتی ہیں تو وہ چیز بنتی ہے۔ جو ان کی سخت دشمن ہے اور تباہ کرنے والی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آگ ہی سے پانی پیدا ہوتا ہے۔"

اسی کالم کے تحت "آتش فشاں پہاڑ" کے زیر عنوان ایک جدول چھپا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس ملک میں کتنے آتش فشاں پہاڑ ہیں اور ان سے نکلنے والا لاوا آخر میں کیا صورت اختیار کر لیتا ہے:

"دنیا میں اس وقت کل 672 آتش فشاں پہاڑ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

ایشیا	24	افریقہ	20	جاوا	109	امریکہ	80	نیوزی لینڈ	63

ان پہاڑوں میں سے (270) پہاڑ ایسے ہیں جن سے "لاوا"

مادہ جاری ہے۔ایک جیالوجسٹ کی تحقیق ہے کہ یہی مادہ زمین سے نکل کر جمع ہونے سے پہاڑ کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔"

''لسان الصدق'' کے شمارہ اگست وستمبر 1904ء میں علی محمود صاحب، بانکی پور کا ایک مضمون ''زبان کا قانون'' شائع ہوا جس سے پہلے مولانا آزاد کا ایک نوٹ بعنوان'' دیسی اور ولایتی الفاظ'' تھا۔ مضمون نگار کا مطمح نظر یہ تھا کہ اردو میں کثرت سے انگریزی الفاظ کے استعمال کا رجحان، زبان کی شیرینی اور فصاحت کے لئے مضر ثابت ہوگا۔موصوف نے اردو میں استعمال کئے جانے والے انگریزی الفاظ کی پانچ قسمیں قرار دی تھیں اور چند ایک مثالوں کے ذریعہ یہ واضح کیا تھا کہ کس قسم کے الفاظ کو اردو میں استعمال کرنا چاہیے اور کس قسم سے احتراز۔مولانا آزاد نے اپنے نوٹ میں مضمون نگار سے اتفاق کرتے ہوئے چند سوالات اٹھائے تھے :

"اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے پاس وہ کون سا معیار ہے جس سے ہم انگریزی کے ان الفاظ میں جن کا استعمال غیر ضروری ہے اور ان الفاظ میں جن کا استعمال ضروری ہے، ایک حد فاصل قرار دے سکیں، کیوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک زبان دوسری زبان سے فائدہ حاصل کرنا چاہے گی تو اس کی علمی اصطلاحات اور وسیع الفاظ کا اس پر ضرور اثر پڑے گا اور ان کے استعمال پرمجبور ہوگی۔ اس لئے ایک ایسا معیار ضرور ہونا چاہیے جس سے ضروری اور غیر ضروری الفاظ میں امتیاز کرسکیں۔"

اس نوٹ میں مولانا آزاد نے بعض انگریزی الفاظ و اصطلاحات جن میں سائنسی اصطلاحات بھی شامل ہیں' کے متبادلات پر بحث کی ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے کہا ہے کہ'' اگرچہ انگریزی کی اصطلاحات کے متبادلات اردو زبان میں مل جاتے ہیں لیکن ان کی معنوی جامعیت کا بدل ثابت نہیں ہوتے اور ان میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو انگریزی الفاظ میں موجود رہتی ہے۔'' چنانچہ سائنس کی ایک اہم شاخ کیمسٹری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

" بعض الفاظ ایسے ہیں کہ اگرچہ اردو میں ان کے لئے کافی الفاظ موجود ہیں لیکن قائل وہ الفاظ کہہ کر جس مفہوم کو سامع

کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے ' اردو الفاظ اس مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہیں ۔ او رممکن ہے کہ بجائے اصلی مفہوم کے سامع ان الفاظ سے کسی دھوکہ میں پڑ جاے ۔ مثلاً انگریزی کا لفظ کیمسٹری ہے ' جس مخزن سے انگریزی میں یہ لفظ آیا ہے ۔ اسی مخزن سے عربی میں اور پھر عربی سے اردو میں کیمیا آیا ہے ۔ اب دیکھو اگر کیمیا کا لفظ استعمال کیا جائے تو ممکن نہیں کہ اس سے سامع علم کیمسٹری کا وسیع مفہوم سمجھ سکے ۔ بلکہ اس کا خیال مشرق کی اس غلط فہمی کی طرف جائے گا جس کا نام کیمیا رکھا گیا ہے ۔ برخلاف اس کے اگر کیمسٹری کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ غلط فہمی کبھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ''

اس تمام بحث سے مولانا آزاد کا مطمح نظر صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ انگریزی کی وہ سائنسی اصطلاحیں جورواج پا چکی ہیں ان کو جوں کا توں برقرار رکھنے اور استعمال کرنے کی ضرورت ہے بغیر اس بات کی کوشش کئے کہ کسی غیر مانوس اردو لفظ کو اس کی بجائے اصطلاح کے طور پر پیش کیا جائے ۔ ہاں سائنس کی ان انگریزی اصطلاحات کے لیے جو اردو والوں کے لئے غیر مانوس ہیں، متبادل اردو اصطلاحوں کا مدون کرنا حق بجانب ہوگا۔

الندوہ

دارالعلوم ندوۃ العلما' لکھنو سے ایک ماہنامہ '' الندوہ '' 1904 سے نکل رہا تھا۔ ابتداً علمی دنیا میں اس کا کوئی خاص مقام نہ تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے جب اس کی ادارت سنبھالی تو اس کا شمار معیاری ادبی اور علمی رسالوں میں ہونے لگا۔ مولانا آزاد اور مولانا شبلی نعمانی کے مابین ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہوا تو مولانا آزاد کی ذہانت اور علمیت سے مولانا شبلی نعمانی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک نجی علمی محفل میں '' فن مناظرہ '' پر جب بحث چھڑ گئی تو مولانا آزاد نے بڑی ہی عمدگی کے ساتھ اپنی مختصری تقریر کے ذریعہ شرکائے محفل کو اس قدر مطمئن کردیا کہ مولانا شبلی بار بار تعریف کرتے اور کہتے رہے کہ مولانا آزاد کا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔ انہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔

پھر ایک دن جب مولانا شبلی نے مولانا آزاد کا ایکس ریز پر تحریر کردہ مضمون "خدنگ نظر" میں دیکھا تو انہیں دعوت دی کہ وہ نہ صرف "الندوہ" کے لئے اس قسم کے مضامین لکھا کریں بلکہ اس کی مجلس ادارت میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر خدمت انجام دیں۔ چنانچہ مولانا آزاد اکتوبر 1905ء میں "الندوہ" کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے اور صرف چھ ماہ کے بعد ہی یعنی مارچ 1906ء میں اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

مولانا آزاد کی ان تحریروں میں جو "الندوہ" کے صفحات کی زینت بنیں' ان میں "مسلمانوں کا ذخیرہ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی" ، "المراۃ المسلمہ" ، "علمی خبریں" ، "القضانی الاسلام" اور چند ایڈیٹوریل نوٹس کے علاوہ "یورپ میں گونگوں کی تعلیم" شامل ہیں۔ "یورپ میں گونگوں کی تعلیم" مارچ 1906ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جس میں مافی الضمیر کے اظہار سے محروم گونگوں میں باہمی مواصلات پر کی گئی تحقیقات کا احاطہ کیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ اس مقصد کے لئے یورپ میں بیسیوں انجمنیں کام کر رہی ہیں تا کہ گونگوں کو بھی قوت گویائی رکھنے والے عام لوگوں کی طرح تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے جاسکیں۔ گونگے پن کی قسمیں اور ان کی وجوہات سے متعلق تفصیلات کے بارے میں ایک مقام پر وہ کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"یورپ میں آج گونگوں کی تعلیم کا جو انتظام ہے ، جس طریقہ سے تعلیم دی جاتی ہے اور جو نتائج ان سے حاصل ہوئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان کا اجمالی بیان ایک علمی خبر کی صورت میں یہاں درج کریں' لیکن اصلی بیان سے پیشتر یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ اس افسوسناک نقص کے اصلی اسباب کیا ہیں ؟ اور یورپ میں آج تعلیم و تربیت کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ کس قسم اور صورت کے گونگوں کے متعلق ہے ؟

گنگ کی دو قسمیں ہیں ، عارضی اور پیدائشی ، بعض حالتوں میں چند عوارض ایسے لاحق ہوجاتے ہیں کہ گلے میں یا زبان میں ایک نقص پیدا ہوجاتا ہے ، آواز بیٹھ جاتی ہے ، زبان کام نہیں دیتی اور ہمیشہ کے لیے بدقسمت انسان قوت گویائی سے محروم ہوجاتا ہے 'اس قسم کا گنگ ، عارضی گنگ ہے ، یورپ میں

تعلیم و تربیت کا جو انتظام کیا گیا ہے ، اسکو اس قسم کے گونگوں سے کوئی تعلق نہیں ۔

پیدائشی گنگ دراصل نتیجہ ہے خلقی بہرے پن کا ، یا عالم طفولیت میں قوت سماعت سے قطعی محروم ہوجانے کا ، انسان کی قوت گویائی کا دار و مدار حقیقت قوت سماعت کی صحت پر ہے ، بچہ جب یکایک عالم وجود میں قدم رکھتا ہے ، تو ہر قسم کی جسمانی اور دماغی قوت اپنے ساتھ لاتا ہے وہ بولتا نہیں لیکن بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے ، منتظر ہوتا ہے کہ خاندانی سوسائٹی کا اثر اس کی رہنمائی کرے ، اور تھوڑے ہی دنوں میں ہزار داستان بنادے اس کے نازک اور ضعیف ترین اعضا بظاہر اٹھنے بیٹھنے ، چلنے پھرنے کے قابل نہیں نظر آتے ۔ مگر ان میں نشوونما کی وہ فطری قابلیت چھپی ہوتی ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے شیرافگن بنا دیتی ہے ۔ اس کی زبان کام نہیں دیتی ، تتلا تُتلا کر بے ربط آوازیں نکالتا ہے اور قوت گویائی کے عجیب و غریب کرشمے سے محض ناآشنا معلوم ہوتا ہے ، مگر قوت سماعت اس کی مدد کرتی ہے ، وہ سنتا ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگ کس طرح باتیں کرتے ہیں ، کس لب و لہجہ میں ان کے الفاظ زبانوں سے نکلتے ہیں ' کس چیز کو کس لفظ سے پکارتے ہیں اور کس حالت کو کس نام سے یاد کرتے ہیں ۔ فطرت کی د وسری بخشی ہوئی قوتیں اس کو سہارا دیتی ہیں ' وہ کوشش کرتا ہے کہ ان کی تقلید کرے اور اسی ترکیب سے اسی لب و لہجہ میں سنے ہوئے لفظوں کو نقل کرے ، رفتہ رفتہ قوت سماعت اس کی نقالی اور تقلید کی اصلاح کرتی رہتی ہے اور قوتوں کی نمو اور ترقی کے ساتھ قوت گویائی بھی طبیعی حد تک ترقی کرتی جاتی ہے اس بنا پر ظاہر ہے کہ جو قابل رحم انسان قوت سماعت سے محروم دنیا میں آیا ، یا بچپن ہی میں اس سے وقت نے بے وفائی کی ، تو چونکہ اس کا دماغ

خارجی آوازوں کے اثر سے بے خبر رہتا ہے ، اس لیے قوت گویائی کو بھی تحریک نہیں ہوتی اور اس کی فطری قابلیت محض بے کار جاتی ہے ، یہی گنگ پیدائشی ، یا حقیقی گنگ ہے، یورپ نے اسی کے علاج کا اور اسی قسم کے گونگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا "

ہیومن فزیالوجی کی تحقیقات کے حوالے سے مولانا نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں میں گونگا پن کن کن حالات میں پیدا ہوتا ہے اور طبی تحقیقات کی روشنی میں انہوں نے اس کے اسباب سے متعلق نتائج اخذ کئے ہیں :

"فزیالوجی کی تحقیقات نے ثقل سماعت کے مختلف اسباب قرار دیے ہیں بعض حالتوں میں کان کی بناوٹ میں کوئی نقص پیدا ہوجاتا ہے یا سماعت کے اندرونی اعضا میں سے کوئی عضو ضعیف ہوجاتا ہے بعض حالتوں میں کوئی مادہ اس طرح حائل ہوجاتا ہے کہ آواز کی موجیں عصب سماعت تک نہیں پہونچ سکتیں ، اس لیے ذہن ان سے متاثر نہیں ہوتا ۔

لیکن یورپ کی عام طبی تحقیقات سے خلقی ثقل سماعت کے چار بڑے سبب دریافت ہوئے ہیں ۔

(1) بہت قریبی رشتہ میں باہمی تزوّج ۔
(2) خاندانی اثر بطور وراثت کے ۔
(3) والدین کا جسمانی ضعف ، یا صرف ماں یا باپ کا ۔
(4) مرض خنازیر

ان چار سببوں میں پہلا سبب خلقی ثقل سماعت کا قوی ترین سبب ہے ، جب کسی خاندان میں عرصہ تک باہمی تزوّج کا طریقہ قائم رہتا ہے تو خاندان کی تمام متفرق بیماریاں اور جسمانی نقص ایک ہی نسل میں جمع ہوجاتے ہیں اور نسل کا بڑا حصہ مختلف عوارض میں مبتلا ہوجاتا ہے ، منجملہ ان کے بڑا عارضہ بہرا پن بھی ہے ، تجربے سے ثابت ہوچکا ہے کہ جن جن خاندانوں

میں یا جماعتوں میں باہمی تزوج کا طریقہ نہیں ہے ، یا کم ہے ، ان کی اولاد اس عارضہ سے عموماًمحفوظ ہوتی ہے ، چنانچہ انگلستان کے بعض فاضل اطبا نے پچھلے دنوں اس مسئلہ پر خاص طورپر توجہ کی اور دریافت کرناچاہا کہ خاص اس سبب سے کس تعداد میں یہ نقص ثابت ہوتا ہے ۔"

اردو میں ابتدا سے تکنیکی موضوعات پر مسلسل لکھنے والے گنے چنے لوگ ہی گزرے ہیں۔ اکثر ایسے نثر نگار ملیں گے جنہوں نے کسی سائنسی ایجاد' دریافت یا بہت بڑے واقعہ جیسے خلاء کی تسخیر' چاند پر انسانی قدموں کی پہنچ وغیرہ کو موضوع بنا کر اس سے متعلق معلومات وتفصیلات پر کچھ لکھا اور قارئین کی نذر کیا۔لیکن مولانا آزاد نے ایسے ایسے انوکھے اور اچھوتے موضوعات اور عنوانات پر قلم اٹھایا ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ الندوہ میں شائع شدہ اس مضمون کو لیجیے جس میں گونگوں کو دی جانے والی تعلیم کو مولانا نے موضوع بنایا ہے۔شائد ہی آج تک کسی مضمون نگار نے اس عنوان پر خامہ فرسائی کی ہو۔

الہلال

مولانا آزاد کی زیرادارت ہفتہ وار" الہلال" 13 جولائی 1912ء کو کلکتہ سے جاری ہوا۔ 18 نومبر 1914 کی اشاعت کے بعد انگریز حکومت نے پرانی طلب کردہ دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط کر لی اور دس ہزار کی نئی ضمانت کا مطالبہ کیا۔جس پر اس کی اشاعت مسدود کردینی پڑی۔ ابتدا میں الہلال کی اشاعت دو ہزار تھی اور آخری دنوں میں یہ 26 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ان دنوں اتنی تعداد میں شائد ہی کوئی اخبار شائع ہوتا ہوگا۔ الہلال کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب اس کا شمارہ10 جون 1927ء کو نکلا۔ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات اور حکومت کی زیادتیوں کی وجہ سے اس کو بھی بند کردینا پڑا۔ اس طرح دوسرے دور میں اس کا آخری شمارہ9 دسمبر 1927ء کو جاری ہوا۔ ماضی میں" الندوہ" کی ادارت سے لے کر" الہلال" کی ادارت تک مولانا آزاد کا صحافتی سفر مختلف وجوہات کی بنا پر وقفہ وقفہ سے جاری رہا۔ 1908ء میں انہوں نے مغربی ایشیا اور فرانس کا سفر اختیار کیا اور 1909ء میں ہندوستان لوٹے۔" الہلال" نکالنے کے بارے میں" ہماری آزادی" میں وہ لکھتے ہیں:

" ہندوستان واپس آنے پر میں نے کچھ وقت مستقبل کا لائحہ عمل بنانے کے سوال پر صرف کیا ۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ رائے عامہ کی تعمیر کے لئے ایک جریدہ کا ہونا ضروری ہے ۔ اس وقت پنجاب اور یوپی سے کئی روزنامے ' ہفتہ وار اور ماہنامے اردو میں شائع ہورہے تھے مگر ان کا معیار کچھ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ جیسے ان کے مضامین غیر معیاری ہوتے تھے ویسی ہی ان کی طباعت اور شکل و صورت بھی تھی ۔ یہ اخبارات و رسالے لیتھو پر تیار ہوتے تھے اس لئے جدید صحافت کے نقطہ نظر سے وہ تصاویر وغیرہ شائع کرنے سے عاری تھے ۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں جوجریدہ نکالوں گا نہ صرف شکل و صورت کے اعتبار سے دیدہ زیب ہوگا بلکہ اس کے مضامین بھی معیاری اور تاثر انگیز ہوں گے ۔ اس فیصلہ کے تحت میں نے الہلال پریس قائم کیا اور اس کا پہلا پرچہ جولائی 1912ء میں شائع ہوا ۔

" الہلال " کی اشاعت اور صحافت ہی نئے باب کا آغاز تھی ۔ بہت تھوڑی مدت گزری تھی کہ اس نے غیر معمولی ہردل عزیزی اور مقبولیت حاصل کرلی ۔ " الہلال " سے عوام کی انسیت کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ اسکی طباعت بہت ہی شاندار تھی بلکہ نئی قومیت کی تعلیم و تبلیغ میں اس کے زبردست اور گراں قدر مضامین بھی تھے ۔ " الہلال " کی مانگ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اولین تین مہینوں میں اسکی تمام پچھلی اشاعتوں کو دوبارہ چھاپنا پڑا کیوں کہ ہر نیا خریدار اس کے پچھلے تمام پرچے طلب کرتا تھا ۔ "

"الہلال" کی ساخت' اس کا گٹ اپ' اس کا کاغذ اور اس میں شائع ہونے والی تصاویر اور مولانا کی نثر کس رنگ ڈھنگ میں پیش ہوتی تھی؟ دوسرے اخباروں کے مقابلہ میں اس کا مقام کیا تھا؟ اس کی تمام تر خوبیاں اور اس کی مقبولیت کس معراج پر پہنچ چکی تھی؟ ان کے بارے میں شمس الدین منیری نے

اپنے مقالے" الہلال اور اردو صحافت" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں :

" الہلال افق کلکتہ سے نکلا اور اس آب و تاب سے نکلا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں مولانا کا ذوق جمالیات اتنا بلند تھا کہ اس سے کم درجہ کی چیز وہ نکال ہی نہیں سکتے تھے ' اس کی ظاہری زیبائی و رعنائی ہی دامن کش دل تھی کہ دیکھنے والا اسی پر فریفتہ ہوجاتا تھا ۔ اس کی معنوی خوبیوں کی طرف تو دیر میں توجہ ہوتی تھی ' خوبصورت و رنگین سرورق پر مولانا کے نام کے ساتھ " مدیر مسئول و محرر خصوصی " کا فقرہ جاذب توجہ ہوتا تھا ۔ آج کل یہ فقرہ رسالوں اور اخباروں میں عام طورپر مستعمل ہے ' مگر بہت سے لوگوں کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ اردو زبان میں مولانا ہی نے پہلے پہل اس فقرہ کو داخل کیا۔ ان سے پہلے لوگ اس سے آشنا نہیں تھے اور خدا جانے اپنے دور صحافت میں مولانا نے ایسے ایسے کتنے الفاظ اور فقرے اردو زبان و ادب میں داخل کیے ' جو آج کل سکہ رائج الوقت بن گئے ہیں ۔مولانا نے جریدہ الہلال کی ظاہری صورت میں ایک انقلاب انگیز تجربہ یہ بھی کیا کہ اسے بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپوانا شروع کیا اور گو لوگ اس وقت تک اردو ٹائپ میں چھپی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے تھے ۔ اور لیتھو کی نستعلیق ہی کے عادی تھے ' مگر الہلال کا ٹائپ میں چھپنا اس کی مقبولیت میں بالکل مانع نہیں ہوا ۔ الہلال میں کاغذ بھی نہایت اعلیٰ سفید گلیزڈ استعمال کیا گیا اور اس میں تصاویر کا بھی خاص اہتمام تھا ۔تصویروں کے بلاک نہایت عمدہ اور صاف ہوتے تھے ...... پھر ان تمام خوبیوں اور زیبائیوں کے ساتھ الہلال نہایت پابندی وقت کے ساتھ نکلتا تھا اور مدتوں نکلتا رہا ۔ اب رہیں الہلا ل کی معنوی اور باطنی خوبیاں تو ابتدا ہی سے اس کے مضامین میں ایسی کشش اور جاذبیت ہوتی تھی کہ لوگ ہفتہ بھر

اس کے لئے چشم براہ رہتے تھے اور جہاں جہاں یہ رسالہ آتا تھا اس کے پہنچتے ہی ایک مجمع ہوجاتا تھا اور لوگ اس پر گرے پڑتے تھے۔ یہ راقم کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ان دنوں ہم لوگوں کا یہی معمول تھا کہ ایک شخص بلند آواز سے الہلال پڑھتا تھا اور سب حلقہ باندھ کر سنتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ "

(آئینہ ابوالکلام آزاد۔ عتیق صدیقی۔ ص73)

"الہلال" میں مولانا آزاد کی صحافت کس انداز کی تھی۔ آیا اس کا انداز مشرقی تھا یا مغربی۔ اس کا معیار اس دور کے دوسرے ہندوستانی اخبارات کی صحافت کے مقابلے میں کیسا تھا؟ ان کی طرز تحریر کیسی تھی؟ الفاظ کا ذخیرہ کتنا تھا؟ ان تمام سوالوں پر نیاز فتح پوری نے اپنے مقالے" مولانا آزاد کی صحافتی عظمت" میں کچھ اس طرح بحث کی ہے :

" میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقینا نہ تھی کیونکہ اس میں شان خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلند بانگ اخبار تھا ' لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی ' سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لیے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انہوں نے ایجاد کیا اور جو انہیں کے ساتھ ختم ہوگئی۔ ...... مولانا کے اسلوب تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں

ایسی تھیں جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت' دوسری اس کی شان خطابت کہ جب ہم الہلال کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہوا پرجوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جارہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک عجیب و غریب طرز تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرات کرسکا۔ "

(آئینہ ابوالکلام آزاد۔عتیق صدیقی۔ص84,80)

الہلال میں دوسرے کالموں کے علاوہ دو مستقل کالم" مذاکرۂ علمیہ" 16 اکتوبر 1912ء کے شمارے سے اور" مقالات" 20 جولائی 1912 کے شمارے سے شائع ہونے لگے تھے۔اول الذکر کالم کے تحت مذہبی مضامین اور آخر الذکر کالم کے تحت قرآنی علوم' اسلامی تاریخ' تہذیب وتمدن' اصلاح معاشرہ اور عالمی مسائل پر مقالات شائع ہوا کرتے تھے۔قارئین کو سائنسی علوم اور اس کی تحقیقات' ایجادات اور دریافتوں سے آگہی پیدا کرنے کے لئے مولانا آزاد نے خود اپنے اور قارئین کے تحریر کردہ مضامین کو اس کے صفحات میں جگہ دی۔سائنسی مضامین کا سلسلہ 1913ء میں اس وقت شروع ہوا جب مولوی احمد علی صاحب نے گجرات سے ایک مراسلہ لکھا تھا۔اس میں انہوں نے" ریڈیم" کی بابت یورپ کے رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کے حوالہ سے ایڈیٹر سے خواہش کی تھی کہ وہ اس کی دریافت اور اس کے خواص پر الہلال میں تحریر فرمائیں۔چنانچہ مولانا آزاد نے ریڈیم پر مضمون لکھا اور کالم" مذاکرہ علمیہ" میں مراسلہ کے ساتھ 26 فروری 1913 کے الہلال میں شائع کیا۔آگے کی اشاعتوں میں ریڈیم پر دو مضامین اور شائع ہوئے۔مولوی عبداللہ صاحب' نا ندیڑ کا مضمون" ریڈیم اور اس کے اثرات" اور الہلال کے دوسرے دور میں مولانا آزاد کے قلم سے" ریڈیم۔خزانہ فطرت کا سب سے کمیاب جوہر" شائع ہوئے۔علم طبیعیات پر مشتمل ان مضامین کے علاوہ مولانا کے مواصلات پر" نامہ بر کبوتر" اور" لاسلکی کاراز" مضامین شائع ہوئے۔علم فلکیات پر مولانا آزاد کے مضامین" غرائب الافلاک" اور" عالم سماوی"

کے علاوہ مرزا عسکری، لکھنو کا مضمون ''علم ہیئت کا ایک صفحہ'' الہلال کے صفحات کی زینت بنے۔ علم کیمیا پر ''صفحۃ من تاریخ الکیمیاء'' اور حیاتیات پر ''الحیات'' ، ''صفحۃ من الحیوان'' ، ''علم نباتات و حیوانات'' ، ''جے سی بوس، روح نباتات اور احساس'' ، ''زمین پر کائنات حیات کا آغاز'' اور نشو و ارتقا پر مضامین شامل ہیں۔ مولانا آزاد کے ان مضامین کے علاوہ حیاتیات پر کئی ایک حضرات نے قلم اٹھایا اور اپنے مضامین الہلال میں شائع کروائے۔ ان میں مولوی عطا محمد صاحب، امرتسر کا ''حیات اور موت کی تعریف'' ، مولوی نواب علی، بڑودہ کا ''حیات بعد الممات'' فاضل صاحب کا ''اخلاق و آداب پر موروثی اثر'' اور عبدالماجد، لکھنو کا ''حظ و کرب'' شامل ہیں۔ علم طب پر مولانا آزاد کے دو مضامین ''شراب کا اثر حیوانات پر'' اور ''خطرناک مکھی'' شائع ہوئے۔ انہوں نے ''طبقات الارض'' کے زیر عنوان خالصتاً سائنسی مضمون لکھا جس میں زمین کے مختلف طبقات و مراتب کا احاطہ کیا تھا۔ اس مضمون کے لیے مولوی محمد قاسم صاحب عثمانی نے مستند کتابوں کا مطالعہ کر کے اس کا مواد مولانا آزاد کو فراہم کیا تھا۔ ٹکنالوجی پر مولانا کے مضامین ''ہوائی جنگ'' ''ہوائی ریل'' ، ''بحری سرنگیں'' اور ''تارپیڈو'' شائع ہوئے۔ علم جغرافیہ اور مہم جوئی پر ''قطب جنوبی'' اور ''قطب جنوبی کے لئے ایک اور مہم'' جیسے مضامین نکلے۔ الہلال میں اصطلاحات پر مضامین اور عربی اور اردو اصطلاحات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا جس میں مولانا آزاد کے بشمول مولوی السید سلیمان الندوی اور مولوی المکارم عبدالوہاب جیسے حضرات نے حصہ لیا۔

مولانا آزاد کے تحریر کردہ سائنسی مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان مضامین کی تیاری میں سائنسی کتابوں کے علاوہ انگریزی کے مشہور اخبارات اور رسائل گلوب، گرافک، سائنٹفک امریکن اور میکانک سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اخباروں کے مضمون نگار، نامہ نگار اور رپورٹرز کے حوالے جابجا ملتے ہیں۔ ''الہلال'' میں سائنسی موضوعات پر مشتمل مضامین پیش کرنے میں مولانا آزاد کے مطمح نظر کے بارے میں سید مظفر حسین برنی ''مولانا آزاد کا مقام، ہندوستانی صحافت میں'' کے زیر عنوان اپنے مقالہ میں یوں روشنی ڈالتے ہیں :

> " آزاد کے ذہن میں ایک سوال یہ تھا کہ اپنے لوگوں کو راہ راست پر کیوں کر لایا جائے کہ وہ عزت و احترام کی زندگی گزار سکیں ' جہالت سے چھٹکارہ پائیں ' توہمات اور افلاس سے

نجات حاصل کریں۔ چنانچہ انہیں احساس تھا کہ مسلمانوں کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے اور اس کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ ان کے خیال میں انسان کا ذہن ایک سادہ کاغذ ہے جس پر علم و ہدایت کا قلم آزادی سے چل سکتا ہے اور ایسی قوتوں کو وجودمیں لاسکتا ہے جن سے معاشرے کے ایک نئے نظام کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ .... انہوں نے جدید سائنس کا علم حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ فروری 1913ء میں انہو ں نے مذاکرہ علمیہ کے عنوان سے ایک کالم جاری کیا جس میں سائنسی مسائل جیسے ریڈیم ' قطب جنوبی میں اسکاٹ کی مہم ' ڈاکٹر ماریا مانٹیسوری کا نیا فلسفہ تعلیم وغیرہ پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ جدید سائنس کی بابت ان کے اس رویہ کا اظہار آٹھ برس پہلے الندوہ کے صفحات پر بھی ہوچکا تھا۔ "

(ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت۔مرتبہ رشید الدین خان۔ص270-271)

مولانا آزاد کے سائنسی شعور کا مطالعہ اس وقت تک تکمیل کے مراحل طے نہیں کرسکتا جب تک ''الہلال'' میں شائع شدہ ان کے سائنسی مضامین کا حوالہ نہ دیا جائے۔ یوں تو ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔لیکن یہاں صرف چند مضامین کے حوالوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔''الہلال'' 2 اپریل1913ء کے شمارے میں ''الحیات'' کے عنوان سے مولانا آزاد کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں برسہا برس سے بنیٔ نوع انسان کے ذہن میں اٹھنے والے سوال ''حیات کیا ہے؟'' کا ٹھوس بنیادوں پر جواب حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس غرض کے لئے برطانوی ماہر فزیالوجی'ایڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر شیفر کے اس عنوان پر منعقدہ جلسہ میں دیے گئے صدارتی خطبہ کے اقتباسات اور ماہرین حیاتیات کی مختلف کتابوں کے حوالے درج کئے گئے ہیں۔فطرت میں پائے جانے والے ذی روح مادوں اور غیر ذی روح مادوں کا تقابل کیا گیا ہے۔ جمادات اور ذی حیات مادوں کے فرق کو واضح کرنے کے لئے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس مضمون کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ حیات کی ضد موت ہے ' مگر یہ

ایک شدید غلطی ہے ' موت کا لفظ حیات سابقہ پر دلالت کرتا ہے ' گو دلالت التزامی ہے ' یعنی موت اس وقت ہوگی جب کہ پہلے حیات ہو۔

علم وظائف الاعضاء ہمیں بتاتا ہے کہ موت کا شمار مظاہر حیات میں ہے ' موت بھی زندگی کا ایک دور ہے ' مگر آخری اور انتہائی۔

اس کے علاوہ تضاد کے لیے احد الضدین کا وجود ہر حالت میں ضروری ہے ' مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً جمادات نہ زندہ ہیں اور نہ مردہ ' اس لیے حیات کا شمار ان کلمات میں کرنا چاہیے۔ جو اضداد نہیں رکھتے۔

عام طورپر یہ سمجھا جاتا ہے کہ " نفس " و " حیات " دونوں ایک ہی چیزیں ہیں ' اس خیال کا منشا غالباً یہ ہے کہ نفس کا تصور اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے ساتھ حیات کا تصور بھی نہ کیا جائے ' اس کے علاوہ تصور نفس میں جس قدر ارتقاء ہوا ہے وہ زندہ اجسام کے ترقی یافتہ ترین مظاہر حیات کے مطالعہ سے ہوا ہے۔

گو یہ خیال عالم گیر ہے ' مگر کسی خیال کا شیوہ اس کی صحت کی دلیل نہیں ' نفس و حیات میں کامل فرق ہے اور یہ فرق اس وقت تک نہیں جاسکتا ' جب تک کہ نفس کے معنی میں اس حد تک وسعت نہ پیدا کی جائے ' جہاں پہنچ کے " نفس " اپنے مابہ الامتیاز معانی سے محروم ہوجائے۔ یہ اس لئے کہ جن مسائل کا تعلق "حیات " سے ہے ' ضرور ان کا تعلق مادہ سے بھی ہے ' پس حیات کا وجود بمعنی علمی بغیر مادے کے ناممکن ہے ' اس کے علاوہ مظاہر حیات اور مظاہر مادہ کے طرق بحث ایک ہی ہیں۔

مظاہر حیات کے نتیجہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ " حیات "

پر بھی انہیں قوانین کی حکومت ہے ' جن کی حکومت جمادات پر ہے '
جس قدر ہمارا مطالعہ مظاہر حیات عمیق ہوتا جاتا ہے ' اسی قدر ہم
اس نظریہ (تھیوری) کے اعتقاد سے قریب اور گذشتہ نظریہ یعنی
مخصوص مگر غیر معلوم اسباب کی طرف انتساب سے دور ہوتے
جاتے ہیں ۔ پس اگر نفس و حیات دونوں مرادف ہوں گے تو اس کے
معنی یہ ہوں گے کہ مباحث نفس بھی مباحث مادہ سے اسی قدر
قریب ہیں جس قدر کہ مباحث حیات قریب ہیں ' حالانکہ ان دونوں
علوم کے مباحث میں وہ نسبت ہے جو خط قطر کے دونوں کناروں
میں ہے ''

طبیعی اور کیمیائی حیثیت سے ذی حیات مادے کس طرح حیات ہی کی طرح عمل کرتے ہیں؟ اور حیات پر مبنی مادہ پروٹو پلازم اور اس سے پیدا ہونے والے کیمیائی اسباب کے کیا نتائج نکلتے ہیں؟ مضمون ''الحیات'' کی دوسری قسط 9 اپریل 1913ء کے الہلال میں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے نظریہ ارتقاء کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماہرین حیاتیات کے نظریات سے بحث کی گئی ہے۔ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذی حیات مادوں میں کیمیائی ترکیب کیا ہوتی ۔ ۔ :

''ذی حیات مادوں کے عناصر قوا کی تعداد مختصر ہے ۔ ان
میں چار عنصر یعنی کاربن ' ہائڈروجن آکسیجن اور نائٹروجن
تو ہمیشہ ہوتے ہیں ان عناصر اربعہ کے ساتھ فاسفورس بھی
ضرور ہوتا ہے فاسفورس پروٹو پلاسم اور مادہ نوائی ' دونوں
میں ہوتا ہے مگر مقدم الذکر میں کم اور موخر الذکر میں زیادہ
تجارب سے معلوم ہوتا ہیکہ شاذ حالتوں کے علاوہ تمام مظاہر حیات
کے لیے کم از کم 70 فیصدی پانی کی ضرورت ہے لیکن بقاء زندگی
کے لیے اتنے پانی کی ضرورت نہیں چنانچہ دیکھا گیا ہیکہ اگر بالکل
نہیں تو ایک بڑی مقدار میں پانی نکل جانے کے بعد بھی بعض ذی
حیات مادوں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا

پانی کی طرح بعض نمک ہائے غیر آلیہ کا وجود بھی ضروری ہے۔ ان نمکوں میں مقدم ترین نمک ' کلورڈ ' سوڈیم اور بعض نمک ہائے کلشیم ' پٹیشیم اور آہن ہے۔ انہی تین عنصروں سے حیات کے مرکب کا قوام ہے۔ "

مضمون "الحیات" کی دوسری قسط کے حاشیہ میں فٹ نوٹ دیے گئے ہیں۔ جس میں جاندار خلیوں (Cells) 'حیاتیاتی جنین (Genes) اور پروٹو پلاسم کو تفصیل سے سمجھایا گیا ہے :

"(1) آگے چل کر خلایا اور خلیہ کا لفظ آئے گا ' اس لیے ان دونوں اصطلاحوں کی حقیقت سمجھ لینی چاہیے۔ حیوانات اور نباتات کے اصل حیات کی ابتدائی تکوین ایک خورد بین تھیلی سے ہوتی ہے ' جو اس قدر دقیق ہے کہ بغیر آلہ خورد بین (میکرسکوپ) کے نظر نہیں آسکتی۔ اسکے اندر ایک متحرک سیال مادہ مثل ایک لعابی مادے کے ہوتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں **(Protoplasm)** پروٹو پلاسم کہتے ہیں۔ افسوس کہ اس کے لیے سردست ہم کوئی اصطلاح وضع نہ کرسکے اور نہ کوئی عربی لفظ آج کل کے تراجم حدیثہ عربیہ میں ملا۔

اسی سیال مادے میں ایک اور چیز مثل گٹھلی کے تیرتی ہوئی نمودار ہوتی ہے اور اسی سے پھر نباتاتی و حیوانی جنین کی تکوین ہوتی ہے۔ یہی گٹھلی ہے ' جس کے لیے عربی لفظ (نواۃ) ہم نے مضمون میں جابجا استعمال کیا ہے۔ "

نہایت ہی دقیق جراثیم جنہیں مائی کروب کہا جاتا ہے اور جو صرف خورد بین کی مدد ہی سے دیکھے جاسکتے ہیں' ان کے متعلق تفصیلات کو مولانا آزاد نے اسی حاشیہ میں یوں بیان کیا ہے :

"(3) انگریزی میں ایک اصطلاحی اسم ہے : مائی کروب **(Microbe)** یعنی وہ نہایت دقیق اور مثل ذرات کے جراثیم نباتاتی و حیوانی جو تمام فضائے ارضی میں پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی جگہ

نہیں جو ان سے خالی ہو ۔ علوم حدیثہ کا یہ ایک عظیم الشان اکتشاف ہے اور اس نے علم تشریح و حیات اور علم الجود والہسوا میں ایک عجیب انقلاب پیدا کردیا ہے۔ سب سے پہلے ان جراثیم کو ایک فرانسیسی مکتشف پروفیسر باسٹر نے دریافت کیا تھا اور فی الحقیقت اس نے عالم انسانیت کی سب سے بڑی خدمت انجام دی ۔

ان جراثیم کا جرم اس قدر دقیق ہوتا ہے کہ دھوپ میں نظر آنے والے ذرات بھی ان کے مقابلے میں نہایت کبیرالحجم ہیں ۔ ان کو چشم غیر مسلح (یعنی بغیر آلات مصنوعی کے) نہیں دیکھ سکتی ۔ اس لیے ان کے دیکھنے کے لیے ایک نہایت قوی المنظر آلہ مائی کراسکوپ (Microscope) ایجاد کیا گیا ہے ' جس کے لیے بہت عمدہ لفظ ہمارے یہاں خوردبین کا رائج ہوگیا ہے ۔ انگریزی میں ان جراثیم کو مائی کروب کہتے ہیں ۔ اور آج کل عربی میں بھی یہی لفظ میکروب کے لہجہ میں رائج ہوگیا ہے ۔ مگر ہم نے اس کی جگہ (خوردبینی جراثیم) کا لفظ وضع کیا ۔

اسی طرح ہر چیز جو خورد بین ہی کے ذریعہ نظر آتی ہو اور نہایت دقیق الجرم ہو ' خور دبینی کی ترکیب سے موسوم کی جاسکتی ہے ۔ یہاں (مادہ خوردبینی) سے تکوین حیات نباتیاتی و حیوانی کی وہ ابتدائی شکل مراد ہے ' جو بصورت ایک گٹھلی کے پروٹوپلاسم میں پیدا ہوتی ہے اور تیرتی رہتی ہے ۔ آج کل عربی کے تراجم علمیہ میں اس کو نواۃ کہتے ہیں اور وہی لفظ ہم نے بھی اختیار کیا ہے ۔ یہ کوئی اصطلاح نہیں ہے بلکہ گٹھلی کو عربی میں نوات کہتے ہیں ۔

یہ گٹھلی بھی اس قدر چھوٹی اور دقیق ہے کہ بغیر خوردبین کے نظر نہیں آسکتی ۔ اسی لیے اس کو مادہ خوردبینی کہنا چاہیے ۔

چونکہ خوردبین کے ذکر میں ضمناً علم جراثیم خورد بینی کا ذکر آگیا ہے اس لیے چند الفاظ اس کی نسبت بھی لکھ دیے گئے ۔"

3 جون 1914ء کے الہلال میں مولانا آزاد کا ایک مضمون ''صفحۃ من تاریخ الکیمیاء'' شائع ہوا تھا ۔جس میں تاریخ کی روشنی میں' بنیادی عناصر پر بحث کی گئی تھی ۔ ماہرین کا ایک گروہ پانی کو اور دوسرا ہوا اور آگ کو عناصر مانتا تھا ۔ ایک تیسرا گروہ خاک کے حق میں تھا ۔ اسطرح عناصر کے متعلق نظریات بدلتے رہے اور آج جن کیمیائی عناصر پر پوری کیمسٹری اساس کرتی ہے اس کے ماننے سے قبل ایک بہت بڑا دور ایسا گزرا ہے جس میں عناصر اربعہ یعنی آگ' ہوا' پانی اور مٹی کو عناصر مانا جاتا تھا ۔ اس مضمون میں ایک جگہ عناصر اربعہ کا تاریخی پس منظر کچھ اس طرح ابھرا ہے :

"دیمقراطیس جو پانچویں صدی قبل پیدائش مسیح میں تھا' کہتا تھا کہ عنصر اصلی صرف ایک مادہ خاکی ہی ہے ۔ یہ مادہ خاکی نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات میں منقسم ہے ۔ یہ ذرات اگرچہ حجم میں باہم مختلف ہیں مگر ان کا مایہ خمیر اور شکل ایک ہی ہے ۔ یہ ذرات ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں ۔ جسم میں جس قدر تغیرات ہوتے ہیں ' وہ انہی ذرات کے اجتماع و افتراق کا (یعنی ملنے اور الگ ہونے کا) نتیجہ ہیں ۔

دیمقراطس کی یہ رائے ذرات کے موجودہ نظریہ سے فی الجملہ مشابہ ہے ۔

اس کے بعد سنہ 440 ق ۔ م میں امبیدکیلیس آیا ۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ عناصر اصلی چار ہیں : آب و آتش و خاک و باد انہی سے تمام اجسام مرکب ہوتے ہیں ۔ یہ خیال ارسطو کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے ۔ بہر حال یہ مذہب خواہ ارسطو کا ہو یا کسی دوسرے حکیم کا ' لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی ان عناصر اربعہ کے مایہ خمیر میں فرق نہیں کیا ۔ یعنی دونوں اپنی اپنی جگہ پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان چاروں کا قوام ایک ہی مادے

سے ہے اور تعداد و اختلاف محض خاصیت کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔

ان مختلف خواص میں سے جن اہم خاصیتوں تک قوت لامسہ کا دسترس ہے وہ چار ہیں: رطوبت ' یبوست ' حرارت ' برودت۔ ہر عنصر اصلی میں دو دو خاصیتیں ہیں۔ مثلاً آگ گرم و خشک ہے۔ ہوا گرم تر ہے ' پانی سرد و تر ہے ' خاک خشک و سرد ہے۔ اس تفصیل میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہر خاصیت گویا دو عنصروں میں مشترک ہے۔

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ ہر عنصر میں دو خاصیتیں ہیں ' لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دونوں مساوی نہیں ہیں کسی عنصر میں ایک خاصیت زیادہ ہے کسی میں دوسری خاصیت۔ چنانچہ ہوا میں رطوبت اور حرارت ہیں مگر حرارت کی مقدار رطوبت سے زیادہ ہے۔ پانی میں برودت اور رطوبت دونوں ہیں ' لیکن برودت رطوبت پر غالب ہے۔ خاک یبوست و برودت کی جامع ہے مگر یبوست غالب ہے۔ آگ یبوست اور حرارت دونوں اپنے اندر رکھتی ہے لیکن غلبہ حرارت کو حاصل ہے۔

انہی خواص کی قلت و کثرت کے ساتھ عناصر کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً اگر پانی کی رطوبت پر آگ کی یبوست غالب آگئی تو اس سے ہوا پیدا ہوجائے گی۔ یا اگر خاک کی برودت پر ہوا کی حرارت غالب آگئی تو اس سے پانی پیدا ہوجائے گا یا اگر آگ کی یبوست پانی کی رطوبت پر غالب ہوگئی تو اس سے خاک پیدا ہوگی اسی طرح اگر پانی کی رطوبت آگ کی حرارت پر غالب ہوگئی تو اس سے ہوا پیدا ہوگی۔ غرض جسم کے ہر قسم کے تغیرات انہی خواص کے تغیر کے ساتھ وابستہ ہیں۔

چونکہ بظاہر ان عناصر میں بعض عناصر کا بعض کی

شکل میں منتقل ہوجانا ممکن تھا ' اس لیے اگر قدماء اسکے قائل تھے
که بعض مادے دوسرے مادوں کی شکل میں منتقل ہوسکتے ہیں تو یہ
کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے ۔ "

مولانا آزاد نے ایک مضمون بعنوان" اختلاف الوان ۔صفحۃ من علم الحیوان" سپرد قلم کیا تھا جو الہلال کے صفحات پر دو اقساط میں شائع ہوا۔اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کرہ ارض پر پائے جانے والے جمادات' نباتات اور حیوانات کے رنگوں میں فرق کا پایا جانا صرف ایسے ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز پوشیدہ رہتا ہے۔قرآنی آیات کی روشنی میں مولانا نے ان رنگوں میں پائے جانے والے فرق کو قدرت الٰہی کی حکمتیں اور مصلحتیں قرار دیا جن کو صاحبان عقل وفکر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بھی بتلایا کہ ماہرین کی رائے میں کسی بھی شئے کا رنگ ان اجزا کے رنگ کا نتیجہ قرار پاتا ہے جن سے وہ ترکیب پاتے ہیں۔ یکم جولائی 1914 ء کے شمارے میں شائع اس مضمون کی دوسری قسط سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے :

" مادی اشیا خواہ وہ حیوانات ہوں یا نباتیات و جمادات ' ان کے لیے اکثر حالتوں میں رنگ لازمی ہے حیوانات اور نباتات ایک طرف رہے ' جمادات میں بھی بمشکل کوئی ایسی مثال ملے گی جس کا پانی اور بعض خاص غازوں (گیس) کی طرح کوئی خاص رنگ نہ ہو۔ چونکہ تمام حیوانات اور نباتات کے جسم جمادات سے مرکب ہیں ' اس لیے طبیعی طورپر ان کے جسموں میں ان جمادات کے رنگوں کا موجود ہونا ضروری ہے البتہ ہماری آنکھوں کو صرف وہی رنگ نظر آتا ہے جو جسم کی بالائی سطح سے قریب ہوتا ہے ۔ مگر جب کسی جسم کی تشریح کی جاتی ہے تو اس میں ان تمام جمادات کے رنگ یا ان کے آثار نظر آجاتے ہیں جن سے ان کا قوام مرکب ہوتا ہے ۔

علم الحیات کی اصطلاح میں حیوانات کی ایک قسم پروٹو زوا (Protozoa) حیوانات اولیٰ ہے ۔ جس قسم کے حیوانات پر اس اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے ان کی نسبت ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا

درحقیقت وہ سلسلہ حیوانات کا اولین حلقہ ہیں یا ان سے پہلے بھی کوئی اور کڑی ہونی چاہیے ؟ قطعی جواب تو اس کا کوئی نہیں دیا گیا اور غالباً دیا بھی نہیں جاسکتا البتہ یہ معلومات موجودہ یہ مسلم ہے کہ اس وقت تک جس قدر حیوانات دریافت ہوئے ہیں ان سب میں بسیط ترین اور اولین حیوان یہی ہیں

ان حیوانات کے جسم سے ایک خاص قسم کا لیس دار مادہ نکلتا ہے اس مادہ سے جب بالوکے ذرے ملتے ہیں تو فوراً چپک جاتے ہیں اور ان سے ایک خول (کیس) سا تیار ہوجاتا ہے عموماً اس خول کا رنگ حیوان کے جسم کا رنگ سمجھا جاتا ہے غور کرو کہ اس میں رنگ کس شے کا ہوگا ؟ ظاہر ہے کہ بالوکے علاوہ اور کسی شے کا نہیں ہوسکتا

حیوانات کے ظاہری اعضا کی طرح اندرونی اعضا کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں مثلاً جگر کا رنگ اور ہے آنتوں کا اور' دل کا رنگ ایک ہے اور گردہ کا دوسرا وھلم جرا مگر ظاہری اعضا کی طرح ان کے رنگوں کا اختلاف بھی فزیولوجیکل اسباب ہی کا نتیجہ ہے چنانچہ ان کی کیمیاوی تشریح کے نتائج اس کی تشفی بخش شہادت دیتے ہیں "

حیوانات کے رنگ ماحول کے رنگوں کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے :

"......حیوانات کی ایک بہت بڑی تعداد کے متعلق ثابت ہوچکا ہے کہ ان کے جسم کی رنگت بعینہ ویسی ہے ' جیسی رنگت ان کے گرد و پیش کے درختوں ' پھولوں ' پتوں ' پتھر اور زمین کی ہے یا ان طبیعی موجودات کی ہے جن سے وہ خطہ گھرا ہوا ہے علماء نشوو ارتقاء نے اس حالت کو ایک خاص موثر طبیعی تسلیم کیا ہے۔ وہ

کہتے ہیں کہ یہ " مماثلت وسط " ہے ۔ یعنی گرد و پیش کے مطابق حیوانات کے جسم کے رنگ کا بھی ہونا ۔

مثلاً شیرنیستان میں رہتا ہے ۔ اس کا اصلی وطن وہی ہے گو وہ کسی غار کے اندر یا دریا کے کنارے بھی لیٹا ہوا نظر آجائے ۔ پس اسی لیے اس کی کھال کے بالوں کا رنگ دھاری دار ' خاکی ' یا مٹیالا ہوتا ہے ۔

بعض شیر ایسے ہیں جو ریگستان میں رہتے ہیں ۔ ریت کی رنگت تمہیں معلوم ہے ۔ پس ان کے جسم کی رنگت بھی گرد آلود ' زردی مائل اور بالکل ریت کی سی ہوتی ہے !

قطب شمالی کی دب کی رنگت دیکھی گئی ہے کہ بالکل سفید ہوتی ہے ' کیونکہ اس کے وطن کی زمین ہمیشہ برف سے سفید رہتی ہے ۔ اسی طرح بے شمار پرند ہیں جو درختوں میں آشیانے بناتے ہیں اور ان کی رنگت بالکل ان پتوں کی سی ہوتی ہے جو ان درختوں کی شاخوں میں لگتے ہیں ۔ "

الہلال میں ملک کے مایہ ناز سائنس داں جگدیش چندر بوس کی علم نباتات میں تحقیقات اور حاصلات پر محیط تفصیلات تین اقساط میں شائع ہوئی ہیں۔جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حیوانات کی طرح نباتات بھی احساس رکھتے ہیں اور ان کے اعصاب نہایت ہی چھوٹے چھوٹے ریشوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔اس مضمون میں بافتوں کے سکڑنے (Muscle Contraction) کے عمل کی روشنی میں چھوئی موئی کے پودوں میں پائی جانے والی حسیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔مضمون کی آخری قسط 5 اگست 1914 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔جس کی ابتدا مولانا آزاد کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"ہم نے گزشتہ سے پیوستہ اشاعت میں پروفیسر جے ۔ سی ۔ بوس کی تقریب کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کی اکتشافات و تحقیقات کو اردو زبان کے حلقہ علمی تک پہنچانے کی کوشش کریں گے ۔ آج اس سلسلۂ مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں :

تم بارہا باغ گئے ہوں گے ' گھانس کے مخملین فرش پر آزادانہ بیٹھے ہوگے ' چمن کی سرخ روشوں پر گلگشت تفرج کی ہوگی ' پھولوں سے دامن بھر بھر کے لطف گلباری اٹھایا ہوگا ' لیکن اس چمن طرازی و گلستان فرمائی میں یہ خیال شاید کبھی نہ آیا ہوگا کہ ہم جس وجود پر اپنی عشرت جویوں کی لا ابالانہ مشقیں کررہے ہیں ' خود اس پر کیا گزر رہی ہے ؟

مگر آج علم کچھ اور کہتا ہے !

کیا نباتات میں بھی احساس ہے اور کیا ا سکے پاس بھی وسائل حس یعنی اعصاب ہیں ؟

اسکے جواب سے پہلے ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اعصاب کا وظیفۂ اصلی کیا ہے ؟

عصب کا اصلی کام یہ ہے کہ ہر ہیجان **(Excitement)** جو اس کے کسی حصے میں پیدا ہو' اسے وہ جسم کے دوسرے حصے تک پہنچا دے۔

اعصاب نہایت چھوٹے چھوٹے ریشوں سے مرکب ہیں جن کو انگریزی میں **Fiber** اور عربی میں خیط کہتے ہیں۔ خیوط اس کی جمع ہے۔ جب جسم کے کسی حصے میں ہیجان پیدا ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مقام کے خیوط میں ایک حرکت پیدا ہوگئی ہے۔ یہی حرکت برقی رو کی طرح آگے دوڑتی ہے اور جس طرح کہ برقی تار کے ایک سرے کی حرکت بسرعت تمام دوسرے سرے تک آجاتی ہے ' اسی طرح ہر ریشہ اپنے بعد کے ریشے کو حرکت دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حرکت مرکز اعصاب یعنی دماغ تک پہنچ جاتی ہے۔ ان تمام سلسلوں کا منبع اور مخزن تاثرات دماغ ہے۔ اقلیم جسم پر اس کی سلطنت انہیں اعصاب کی بدولت قائم ہے !

مثلاً تم نے گلاب کا ایک پھول دیکھا ۔ اب سونچو کہ کیونکر دیکھا اور اس میں کون سے فزیولوجیکل (وظائف الاعضاء) اعمال انجام پائے ؟

جب تم نے آنکھیں کھولیں تو شعاعیں شبکیہ پرپڑیں اور ان شعاعوں کی وجہ سے شبکیہ میں‌ایک ہیجان سا پیدا ہوا اس کے بعد اعصاب کا فعل شروع ہوا اعصاب بصارت نے اس حرکت کو لے لیا اور بطریق مذکورہ بالا دماغ تک پہنچا دیا ۔

اس سلسلے میں ایک امر اور بھی قابل ذکر ہے ۔ اگرچہ ہیجان کے دماغ تک پہنچا دینے کے بعد عصب کا کام ختم ہوجاتا ہے ' مگر یہ ہیجان خود ختم نہیں ہوجاتا بلکہ عضلات کی طرف بھی منتقل ہوسکتا ہے اور اس صورت میں متقلص (سکڑنے والے) عضلات میں ایک قسم کا جھٹکا پیدا ہوجاتا ہے "

انسان کی استفہامیہ نظریں سب سے پہلے آسمان کی طرف اٹھتی ہیں یہاں تک کہ جب بچے بولنا سیکھتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے بڑوں سے جو سوالات کرتے ہیں وہ عام طور پر آسمان' چاند اور ستاروں سے متعلق ہی ہوتے ہیں ۔ جبکہ زمین پر کی اشیا کے بارے میں استفسار بڑے ہونے کے بعد کرتے ہیں ۔

دور بین کی ایجاد نے اجرام فلکی کے مشاہدہ میں کافی وسعت پیدا کی اور فلکیات میں نت نئی انکشافات کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ مولانا آزاد کا ایک مضمون" غرائب الافلاک" کے عنوان سے 7 اور 14 جنوری 1914 کے الہلال میں شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون میں ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں :

" حیوان اور انسان دونوں ایک ہی شے کو دیکھتے ہیں ۔ وہ شے اگر حیوان کے لیے ضرورت کی ہوتی ہے اور اس کو اس وقت اس شے کی حاجت بھی ہوتی ہے تو وہ رکتا ہے اور اس سے متمتع ہوتا ہے ' ورنہ ایک غلط انداز نظر ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے ۔

لیکن انسان بہر حال رکتا ہے اور سونچتا ہے کہ یہ کیا ہے ؟ کہاں سے آئی ؟ کیوں کر آئی ؟ وغیرہ وغیرہ

یہی شے ہے جس کو " تجسس و تفحص " کہتے ہیں اور یہی انسان کے تمام علوم و معارف کا سرچشمہ ' اور اس کے مساعی و مجاہدات فکریہ کا محرک اصلی ہے اور اسی لیے قرآن کریم نے جابجا تدبر و تفکر پر زور دیا ہے ۔

لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اس تجسس کے عمل کا آغاز زمین اور اس کے قرب و جوار کی اشیا کے بدلے سب سے پہلے آسمان سے ہوتا ہے ۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ بچے جب پوری طرح بولنے لگتے ہیں اور اپنی ماں کی آغوش میں شب کو صحن میں بیٹھتے ہیں تو کون وما فی الکون کے متعلق ان کے سوالات کا آغاز آسمان اور ستاروں ہی سے ہوتا ہے ۔ وہ پوچھتے ہیں کہ " آسمان کیا ہے؟ کیا ستارے اس میں جڑے ہوئے ہیں ؟ چاند بھی جڑا ہے ؟ چاند کیا چلتا ہے ؟ کیا اس کے بھی ہماری طرح پاؤں ہیں ؟ "

اس کے مقابلہ میں آب و آتش ' خاک و باد ' اشجار و اثمار ' حیوانات و جمادات ' یعنی جو چیزیں زمین کے متعلق ہیں ' ان کی نسبت سوال کی نوبت بمشکل سن شعور تک پہنچنے کے بعد آتی ہوگی ۔ "

علم فلکیات کی جدید تحقیقات سے متعلق وہ اپنے بیان کو یوں جاری رکھتے ہیں:

"قدیم علم الفلک میں صرف ایک آفتاب مانا جاتا تھا ' مگر موجودہ علماء نے جدید آلات رصدیہ کی مدد سے ایک ہزار ملین آفتاب دریافت کئے ہیں ۔ یہ تمام آفتاب مع اپنے سیارات کے اس فضائے بسیط میں گردش کرتے رہتے ہیں ۔ جب کبھی دو آفتابوں میں تجاذب ہوتا ہے اور وہ قریب آجاتے ہیں تو ان کی رفتار چار سو میل فی ثانیہ ہوجاتی ہے ۔ اس حساب سے وہ ایک گھنٹہ سے کم میں مقابل بھی

ہو جاتے ہیں اور جدا بھی ہو جاتے ہیں۔

آفتابوں کی کثرت ' ان کی گردش اور تجاذب و تقارب کے وقت ان کی سرعت رفتار کی بنا پر علماء فلک کا خیال ہے کہ دو آفتاب خواہ کتنے ہی دور ہوں مگر ان کا تصادم ہر وقت ممکن ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس وقت دو ایسے آفتابوں میں جو چار سو میل فی ثانیہ کے حساب سے چل رہے ہوں ' تصادم ہوگا تو کیسی قیامت برپا ہوگی !

یہ ہیں ان صدہا غرائب افلاک میں سے چند عجائب ' جو جدید علم الفلک نے ہمیں بتائے پس اگر علم الفلک اپنے قدیمی مرکز پر رہتا تو یہ تمام حقائق اسی طرح ہمیشہ مستور و مخفی رہتے جس طرح کہ اس دور جدید سے پہلے تک رہے "

اسپکٹر اسکوپ ایک ایسا آلہ ہے جس کی مدد سے اجرام فلکی کی ہئیت اور نوعیت کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ اس کیلئے جامعہ عثمانیہ نے ''طیف پیا'' اور مقتدرہ پاکستان نے ''طیف نما'' اصطلاح مدون کی تھی۔ مولانا آزاد نے اس کے لئے اصطلاح کیا ہونی چاہیے اس پر حاشیہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ :

"یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک اسپیکٹرا اور دوسرا اسکوپ۔ اسپیکٹرا جمع ہے اسپیکٹرم کی جو ایک لاطینی نژاد کلمہ ہے۔ اسپیکٹرم کے لغوی معنی ہیں وہ مختلف رنگ جو آنکھیں بند کرنے کے بعد نظر آتے ہیں۔ مگر اصطلاح میں نور کے ان رنگوں کو کہتے ہیں ' جو ایک مثلث آلہ کے ذریعہ سے ' جسے **Prism** کہتے ہیں جدا کرکے اس طرح دکھائے جاتے ہیں ' گویا وہ کسی جالی پر پھیلا دیئے گئے ہیں۔ اسکوپ کے معنی ہیں " نما " پس اسپیکٹرا اسکوپ کے لفظی معنی ہوئے " الوان نور نما " اور یہی اس آلہ کی تعریف ہے۔

لیکن " الوان نور نما " کی ترکیب طویل و ثقیل تھی۔ اگر نور حذف کردیا جائے اور الوان کو رنگ سے بدل دیا جائے تو یہ " رنگ

نما" ہوسکتا ہے۔ یہ ترکیب سبک و سہل ہے اور بآسانی زبانوں پر جاری ہوسکتی ہے۔ اسی لیے میں نے صرف رنگ نما کو اختیار کیا۔ البتہ اس صورت میں معنی لغوی معنی اصطلاحی سے کسی قدر عام ہوں گے مگر تداون و استعمال سے اس نقص کی تلافی ہوجائے گی اور تھوڑے عرصے کے بعد " رنگ نما " سے بھی اسی طرح خاص آلہ متبادر ہونے لگے گا ' جس طرح کہ آج خورد بین ' دور بین ' مرغ باد نما ' وغیرہ سے خاص خاص آلات ہی متبادر ہوتے ہیں۔ "

مولانا آزاد کا ایک مضمون الہلال کے 12 اگست 1927ء کے شمارے میں بعنوان" زمین پر کائنات حیات کا آغاز" شائع ہوا تھا۔اس میں زمین پر زندگی کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟اور زمین کی حالت موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے کیا تھی؟اور اس پر انقلاب کے کتنے دور گزر چکے ہیں؟ جیسے اہم سوالات پر بحث کی گئی ہے۔ایک مقام پر وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"روئے زمین پر ذی روح مخلوقات بہت مدت سے موجود ہیں۔ ماہرین طبقات الارض کا تخمینہ دس کڑوڑ سال کا ہے بلا شبہ یہ تخمینہ ظنی ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ بہت ہی قدیم زمانوں سے زمین پر زندگی موجود ہے۔ زمین کی زیادہ سے زیادہ گہری اور پرانی پرتوں اور تہوں میں بھی زندہ کائنات کے نشان ملے ہیں۔

زمین پر زندگی کا آغاز کب ہوا اور کس طرح ہوا: اس سوال سے پہلے یہ بحث سامنے آتی ہیکہ موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے خود زمین کی حالت کیا تھی اور اس پر کتنے دور انقلاب کے گزر چکے ہیں ؟

زمین ' نظام شمسی میں داخل ہے۔ اس نظام میں آفتاب مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور سیارہ (گردش کرنے والے ستارے) اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ ستارے سورج سے بہت دور ہیں۔ مرکز سے جتنی دوری بڑھتی ہے اتنا ہی فاصلہ بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔

مریخ اور مشتری کے مابین ایک عظیم دائرہ موجود ہے۔ اس میں سو سے زیادہ چھوٹے چھوٹے سیارات ' آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں اور اس سے تقریباً دس کڑوڑ میل دور ہیں۔

ہر بڑے ستارے کیساتھ ایک یا کئی چاند ہیں۔ اور اس کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ زمین کے ساتھ ایک ' مشتری کے ساتھ چار ' زحل کے ساتھ دس ' اورانوس کے ساتھ چار اور نبٹون کے ساتھ ایک ہے۔

آفتاب اپنے مرکز میں رہ کر تمام کواکب کو اپنی طرف جذب کرتا اور کھینچتا ہے۔ یہ تمام کواکب اور آفتاب مختلف قسم کی دھاتوں ' چٹانوں اور مشتعل گیسوں سے مرکب ہیں۔ یہ دھاتیں اسی قسم کی ہیں جیسی زمین میں ہم دیکھتے ہیں۔ آفتاب ان تمام کواکب سے بہت بڑا ہے۔"

"عالم سماوی' کیا ستارے زندگی سے محروم ہیں" کے عنوان پر مولانا کا ایک مضمون 14 اکتوبر 1927ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جس میں ماہرین فلکیات کے مختلف گروہوں کے نظریات کے پیش نظر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیا کائنات میں زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر بھی زندگی کے آثار ہو سکتے ہیں؟ اس بات کے امکانات پر بھی غور کیا گیا کہ زمین پر زندگی کے لئے جن اجزا کی ضرورت ہوتی ہے وہ دوسرے سیاروں پر مختلف ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں کہیں پر دوسری ہی قسم کی زندگی ہو اور وہ فہم و فراست میں' ترقی میں کرہ ارض پر بسنے والوں سے بہت آگے ہوں۔

اس مضمون کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہے :

"ہم تاروں بھری رات میں نظر اٹھاتے ہیں تو آسمان پر بے شمار ستارے نظر آتے ہیں۔ یہ ستارے درحقیقت ویسے ہی کرے ہیں ' جیسا ایک کرہ خود ہماری زمین ہے۔ ان ستاروں میں بہت سے ستارے ہماری زمین سے بھی بہت زیادہ بڑے اور بہت زیادہ عمر کے ہیں۔ بعض ہماری زمین سے چھوٹے اور اس سے کم عمر رکھتے ہیں۔

یہ تمام ستارے بھی ویسے ہی ایک نظام سے وابستہ ہیں جیسا ہمارا نظام شمسی ہے۔ ان میں بھی آفتاب ہیں اور اپنے گرد بہت سے کواکب اور سیارے رکھتے ہیں۔

مدت سے علماء فلک میں سخت اختلاف ہے کہ یہ ستارے بھی ہماری زمین کی طرح زندہ موجودات سے آباد ہیں یا نہیں ؟ ایک گروہ پہلی رائے کا قائل ہے۔ دوسرا دوسری رائے کا۔

پہلے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ زندگی کے لیے جن شرطوں کی ضرورت ہے ' وہ زمین کے علاوہ ان ستاروں میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ کئی وجوہ سے ناقابل تسلیم ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان شرطوں کی عدم موجودگی کا ثبوت کیا ہے ؟ کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ ہوا ' پانی ' نور ' حرارت وغیرہ لوازم زندگی سے یہ ستارے بالکل خالی ہیں ؟ بلا شبہ اب تک ان کے وجود کی بھی کوئی دلیل ہمارے علم میں نہیں آئی۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ یہ چیزیں وہاں موجود ہوں اور ہماری تحقیقات میں ابھی نہ آئی ہوں۔ حال ہی میں انسانی علم نے معلوم کرلیا ہے کہ بعض ستاروں میں آکسیجن موجود ہے جو زندگی قائم رکھنے والی ہوا کا اصلی جز ہے۔

پھر یہ دعویٰ بھی بالکل بے دلیل ہے کہ زندگی کی جو شرطیں ہمیں معلوم ہیں ' ان کے بغیر زندگی کا وجود ممکن نہیں۔ بلاشبہ ہماری زمین پر زندگی ان شرطوں کے بغیرناممکن ہے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ دوسرے ستاروں کی طبیعت بھی بالکل ویسے ہی ہو جیسی ہماری زمین کی ہے ؟ یہ بھی ضروری نہیں کہ زندگی کا ظہور ان ستاروں میں بھی ویسا ہی ہو جیسا اس زمین میں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان ستاروں میں زندگی کی شکلیں بالکل مختلف ہوں۔ اجسام کی ساخت جدا ہو ' اعضاء و عضلات دوسری وضع کے ہوں۔ زندگی کے لوازم مختلف ہوں۔ ستاروں کی کائنات پر ایک

ہی اعتبار سے قیاس کرنا اور ان پر یکساں حکم لگانا ' صحیح نہیں ہوسکتا

دوسرے گروہ کا بیان بڑی حد تک مقبول ہے وہ کہتا ہے ہماری زمین کیا ہے ؟ اس لامتناہی فضا میں بہنے والے لکھوکھا کروں میں سے ایک چھوٹا سا کرہ ہے زمین کو ظاہری اعتبار سے دوسرے کروں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں نہ تو اس کا حجم ہی سب سے بڑا ہے نہ عمر ہی سب سے زیادہ ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اس میں زندگی موجود ہو اور باقی تمام کرے جو اس سے کہیں زیادہ بڑے اور قدیم ہیں زندگی سے بالکل خالی سمجھے جائیں ؟"

کائنات میں دوسرے سیاروں پر پائی جانے والی زندگی کے امکانات اور ان کے لئے درکار اجزائے ضروری کے مختلف ہونے کا تذکرہ ذیل کی تحریر میں یوں ملتا ہے :

"ممکن ہے ستاروں میں زندگی کا قوام ہماری زمین کی زندگی کے قوام سے مختلف ہو مثلاً آکسیجن ہمارے لیے ضروری ہے ' مگر دوسرے ستاروں کی مخلوقات کے لیے ضروری نہ ہو ظاہر ہے کہ ستاروں کے جاندار ہم سے مختلف ہوں گے ' کیونکہ ان کا ماحول ہم سے بالکل مختلف ہے ہمارے ان کے درمیان مابہ الاشتراک صرف روح ہی ہوسکتی ہے اور معلوم ہے کہ روح نہ تو کوئی شکل رکھتی ہے نہ مادے کے تابع ہے خود اپنی اسی زمین پر ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں مخلوقات اپنی جسمانی ترکیب اور ضروریات زندگی میں ایک دوسرے سے پورا اختلاف رکھتی ہیں ۔ تاہم سب زندہ ہیں اور سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے ۔ جب خود زمین پرمخلوقات کا اختلاف اس درجہ زیادہ ہے تو ظاہر ہے دوسرے ستاروں کی مخلوقات ہم سے کیوں مختلف نہ ہو ؟

چونکہ ہماری زمین سب سے زیادہ قدیم نہیں ہے ' اس لیے

ممکن ہے ' دوسرے ستاروں میں زندگی زیادہ قدیم اور بہت ترقی یافتہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ بعض ستاروں کی مخلوق اس درجہ ترقی کرگئی ہو کہ ہم سے بہت زیادہ علم و حکمت رکھتی ہو۔ ہم سے بہت زیادہ اسرار و جود سے واقف ہو۔ ہم سے کہیں زیادہ اس کی ایجادیں محیرالعقول ہوں۔ ممکن ہے اس کے پاس ایسے ذرائع موجود ہوں کہ قریب کے دوسروں ستاروں تک بھی پہنچ سکتے ہوں اور روح و مادہ کے راز معلوم کرچکی ہوں۔ ممکن ہے کہ ان کے جسم ہمارے ہی جیسے ہوں۔ ممکن ہے ہم سے بالکل مختلف ہوں۔ بہت ممکن ہے وہ ہم سے زیادہ حواس رکھتے ہوں۔"

میڈیکل سائنس کے موضوع پر مولانا آزاد کا ایک مضمون بعنوان" شراب کا اثر حیوانات پر" 2 ستمبر 1914ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ شراب کے مضر اثرات صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جانوروں پر بھی ہوتے ہیں۔ کتوں اور بلیوں پر کئے گئے مغربی طبی ماہرین کے تجربات کی روشنی میں یہ انکشاف کیا گیا کہ شراب کا مسلسل استعمال ان میں بزدلی' پست ہمتی' کاہلی اور خوف و ہراس پیدا کرتا ہے اور ان کی نسل مردہ' بیمار اور کمزور ہوتی ہے۔ مولانا آزاد اس مضمون کی شروعات کچھ اس طرح کرتے ہیں :

"شراب کی مذمت مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ لیکن اس کی مذمت میں سب سے زیادہ عام اورمتداول فقرہ یہ ہے کہ " انسان شراب کے نشے میں انسان نہیں رہتا بلکہ جانور بن جاتا ہے "

لیکن سوال یہ ہیکہ خود جانور بھی شراب کی بدمستی میں جانور باقی رہتا ہے یا نہیں ؟

جدید طبی اختیارات سے ثابت ہوگیا ہے کہ شراب حیوانات کی قوت شعور اور حس و ادراک میں بہت بڑا انحطاط پیدا کردیتی ہے۔ اس لیے وہ باغیان احکام شریعت 'جو شراب کے نشے میں چور رہتے ہیں ' فی الحقیقت اسی درجہ کے جانور ہیں ' جن کے پست درجہ

کو شراب اور بھی پست تر کردیتی ہے : "ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا"۔ وہ لوگ بالکل جانور ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر!"

مولانا آزاد ایک مقام پر حدیث مبارکہ کی روشنی میں اور جدید طبی تحقیق کے حوالے سے انسانی صحت پر شراب کے مضر اثرات کا ذکر یوں کرتے ہیں :

"اسلام ایک دین الٰہی و فطری ہے۔ فطرت کے قوانین کے انکشاف کے ساتھ اس کے اسرار و مصالح بھی روز بروز نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ہم لوگ سرد ملک کے رہنے والے ہیں اور اعمال شاقہ میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم کو حرارت اور قوت و نشاط کی زیادہ ضرورت ہے اس لیے ہم لوگ گیہوں کی شراب پیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ نشہ آور ہے ؟ انہوں نے کہا " ہاں " آپ ﷺ نے سختی کے ساتھ ان کو ممانعت کردی۔

جدید طبی تحقیقات آج حرف بحرف اس کی تائید کرتی ہے۔ انسان کے نظام عصبی پر شراب کا جو اثر پڑتا ہے اس کا بھی مختلف طریقوں اور مختلف آلات سے تجربہ کیاگیا ہے۔ "

اس مضمون میں یہ بات بتائی گئی تھی کہ شراب میں غذائیت نہیں ہوتی بلکہ اس کے اثرات سے انسانی جسم کے وہ اعضا جو غذا سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ اپنے عوامل سے باز رہتے ہیں اور انسانی صحت پر برے اثرات مرتب کرتے ہیں :

"لیکن شراب کی مضرت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خود جزو بدن ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کا اصلی نقصان یہ ہے کہ دوسری غذاؤں کو بھی جزو بدن نہیں ہونے دیتی۔ چنانچہ تجربہ سے ثابت ہوا کہ اگر کھانا کھانے کے بعد ایک شخص سے کوئی بوجھ اٹھوایا جائے تو وہ اس کو متعدد بار اٹھا سکے گا ' لیکن اگر کھانے کے ساتھ اس کو شراب بھی پلا دی جائے تو اس کے جسم کی قوت کم

ہو جائے گی اور وہ اس بوجھ کو متصل کئی بار نہ اٹھا سکے گا۔

> اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ طبیعت ہمیشہ مرغوب چیزوں کی طرف توجہ کرتی ہے ' اس لیے جب غذا کے ساتھ شراب پی لی جاتی ہے تو تمام قوائے طبیعیہ شراب ہی کے کیف و سرور میں رقص مستانہ کرنے لگتے ہیں اور اپنے وظائف ضروریہ کی طرف ملتفت نہیں ہوتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غذا غیر منہضم رہ جاتی ہے اور جزو بدن نہیں ہونے پاتی شراب میں بجائے خود ایسے اجزا غذائیہ موجود نہیں ہیں جو اس کمی کا بدل ما یتحلل ہوسکیں 'اس لیے تمام نظام جسمانی دفعتاً کھوکھلے درخت کی طرح گر پڑتا ہے اور اعصاب کے ریشے بیخ و بن سے اکھڑ جاتے ہیں !"

فطرت میں جہاں انواع واقسام کے جاندار پائے جاتے ہیں وہیں سمندر کی دنیا بھی مختلف اقسام کی مچھلیوں' جانداروں اور حشرات سے بھری پڑی ہے۔ چند مچھلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے تیرنے کے دوران ان میں برقی قوت پیدا ہوتی ہے جس کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی دوسرا جاندار ان مچھلیوں سے حالت تماس میں آتا ہے۔ یہ مچھلیاں اپنی اس خصوصیت سے شکار کو برقی شاک دے کر اپنے قابو میں کرلیتی ہیں تاکہ انہیں اپنا نوالہ بنا سکیں۔ ان مچھلیوں میں تارپیڈو' برقی رے' ستارہ بیں اور برقی ایل قابل ذکر ہیں۔ فطرت کی عجائب روزگاری پر مولانا آزاد نے اپنے مضمون ''برقی مچھلیاں'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو'' الہلال'' کے شمارے 24 جون 1927 ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی تمہید کچھ اس طرح ہے :

> ''حکمت الہٰی کی کار فرمائیاں بھی کیسی عجیب و غریب ہیں ! انسان نے لاکھوں برس کی سراغ رسانیوں کے بعد کائنات کی ایک سب سے بڑی قوت کا کھوج لگایا جس کا نام قوت برق ہے۔ یہ قوت آج اس کی کاربراری کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ زمین اس سے روشن ہوتی ہے۔ آسمان پر طیارے اسی کے ذریعہ اڑتے ہیں۔ سواری کے لیے سب سے بڑا مرکب یہی ہے۔ کارخانوں کے لیے سب سے بڑی قوت

حرکت اسی سے ملتی ہے ۔ خبر رسانی میں اسی کی پیغام بری پر آج بحر و بر کا دار و مدار ہے ۔ زمین کی طاقت کے تمام خزانے خالی ہوجائیں لیکن اس لازوال خزانے کے ختم ہوجانے کا کبھی اندیشہ نہیں ۔

لیکن جب انسان نے اس عجیب خزانہ قوت پر قبضہ کرکے فخر و غرور سے سراٹھایا تو قدرت نے اپنے پردہ اسرار کا ایک نیا گوشہ کھول دیا ۔ انسان نے دیکھا اور دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ جس چیز کو وہ اپنی طاقتوں کا سب سے بڑا خزانہ سمجھ کر اس قدر مغرور ہو رہا ہے وہ قدرت کے کارخانہ حیات میں اس سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی کہ چند حقیر اور مجہول جانوروں کے جنگ و شکار کا ایک معمولی سا ہتھیار ہے !

قدرت نے ہر جاندار کو کسی غذا کے حصول کے لیے مختلف قسم کی قوتیں اور طرح طرح کے آلات دیے ہیں ۔ کسی جانور کے پاس بڑے بڑے پنجے ہیں ۔ کسی کے پاس لنبے لنبے دانت ہیں ' کوئی سینگ کے ہتھیار سے لڑتا ہے کوئی اپنی تیز سانس کے ذریعہ اپنا شکار کھینچ لیتا ہے ۔ ایسا ہی ایک ہتھیار برقی قوت کا خزانہ (بیٹری) بھی ہے ۔ جن جانوروں کے پاس یہ خزانہ ہے وہ اسے ایک ہتھیار کی طرح کام میں لاتے ہیں ۔ جب ان کا شکار قریب آتا ہے تو برقی قوت کی لہرات بے ہوش یا شل کرکے ڈال دیتی ہے اور وہ اسے بہ آسانی اپنا نوالہ بنالیتے ہیں !

ان جانوروں کا برقی خزانہ ان کے دوران خون کی حرکت سے کچھ عجیب سا تعلق رکھتا ہے کہ ہمیشہ برقی قوت اس سے حاصل ہوتی رہتی ہے ۔ قوت کی تیزی اور اجراء کے لیے محرک کی ضرورت ہے ۔ یہ کام ان کے جوش اور غضب کے ہیجان سے لیا جاتا ہے ۔ جونہی وہ جوش میں آتے ہیں ' غضب و ہیجان کی حرارت

برقی خزانہ کے لیے تازہ قوت بہم پہنچا دیتی ہے اور برقی لہریں تیزی کے ساتھ اٹھنے اور ٹکرانے لگتی ہیں !

ان جانوروں میں سب سے زیادہ عجیب برقی مچھلیاں ہیں۔ "

15 جولائی 1914ء کے شمارے میں "خطرناک مکھی" کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں اس بات کا احاطہ کیا گیا ہے کہ گھروں میں پائی جانے والی مکھیاں جراثیم کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچاتی ہوئی ہماری صحت کے لئے کس قدر نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ گھروں میں مکھیوں کی تعداد کو کم سے کم کرنے کے لئے ہمیں کیا تدابیر اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

"سائنس کے تجارب سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ گھرکی معمولی مکھیاں سخت خطرناک چیزیں ہیں۔ یہی ہوائی سیاح ہیں جو ایک شخص کی بیماری دوسرے تک لے جاتی ہیں ' اور اس لیے اس قدر حقیر نہیں ہیں جس قدر کہ عام طورپر سمجھا جاتا ہے ہرگھر کے لیے جس میں صحت اور تندرستی کی قیمت محسوس کی جاتی ہو ' ضروری ہیکہ انکی تعداد کم کرنے کے لیے ایک سخت جہاد شروع کردے ' تاکہ وہ بیماریاں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں ' کم ہوجائیں اور کچھ دنوں کے بعد بالکل معدوم ......

اگر ہم لوگ اپنے گھر کو پاک و صاف رکھیں تو ہمارے بچوں کی صحت اچھی رہے گی ' گرمی میں جو بیماریاں بکثرت ہوتی ہیں بالکل نہ ہوں گی ' ٹائیفوڈ کم ہوجائے گا ' ڈاکٹر کا بل بھی کم آیا کرے گا ' گھر کا ہر فرد چین اور سکھ کی زندگی بسر کرے گا۔ خدا اور اس کے بندے ' دونوں کی خدمت صرف تندرست آدمی ہی کرسکتا ہے۔ پس آؤ ' ہم لوگ اسی کے مطابق عمل کریں !"

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ گھروں کو جتنا پاک وصاف رکھا جائے گا اتنا ہی ان مکھیوں سے چھٹکارہ پایا

جاسکتا ہے۔غذاؤں کوڈھانک کررکھنے سے بھی ان مکھیوں کے زہریلے اثرات سے بچا جاسکتا ہے۔اس بات کومولانا نے حدیث کی روشنی میں واضح کیا ہے۔جواس تحریر سے صاف ظاہر ہے :

"آج جب که علوم کی انتہائی ترقیات و کشفیات سے یه نتیجه اخذ کیا گیا ہے که مکھیوں سے غذا کو بچانا چاہیے اور سخت تاکید کی جارہی ہے که غذا کو ڈھانپ کر رکھا کرو ' تو ان احادیث نبویه کو بھی یاد کرلینا چاہیے جن میں نہایت اصرار سے تاکید کی گئی ہے که کوئی چیز کھانے کی کھلی نه رکھو۔

اس قسم کی احادیث بکثرت وارد ہیں اور عموماً کتب حدیث کے ابواب اطعمه و آداب اکل و شرب میں درج کی گئی ہیں ۔ بعض کتابوں میں " تغطية الاوانی " کا مستقل باب رکھا گیا ہے اور اسکے تحت میں اس قسم کی تمام حدیثیں جمع کردی ہیں ان سب پر نظر ڈالنے کے لیے بہترین کتاب جمع الجوامع ہے ۔ امام غزالی نے بھی احیاء میں ذکر کیا ہے ہم صرف بخاری و مسلم کی ایک متفق علیه حدیث یہاں نقل کردیتے ہیں :

جاء رجل من الانصار باناء من لبن الی النبی صلی الله علیه و سلم ۔ فقال الا خمرقه ولو ان تعرض علیه عوداً

ترجمه : آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک شخص برتن میں دودھ لایا ۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا که تو نے اسے ڈھانکا نہیں ۔ کسی تنکے ہی سے سہی لیکن ڈھانک دینا ضروری ہے ۔ "

ریڈیم کی ایجاد'اس کے خواص اوراس کے استعمال سے الہلال کے قارئین کوواقف کروانے کے لئے اوپر جن تین مضامین کاذکرکیا گیا ہےاس کا آخری مضمون'' ریڈیم'خزانۂ فطرت کاسب سے کمیاب جوہر'' ہے جو5 اگست 1927ء کے رسالے میں شائع ہوا تھا۔سائنس کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین اس کواپنے اپنے شعبوں کے لئے کتنا کارآمد سمجھتے ہیں'ملاحظہ کیا جاسکتا ہے :

"آخر ریڈیم ہے کیا چیز جس کی جستجو میں سارا عالم

سرگرداں ہورہا ہے اورجس کی مدح و ثنا میں دنیا کے تمام علماء رطب اللسان ہیں ؟

ماہر کیمیا سے پوچھو۔ وہ بڑے جوش سے جواب دے گا "ریڈیم اگرچہ لوہے ' تانبے ' توتیے کی طرح ایک دھات ہے مگر سب دھاتوں سے زیادہ وزنی ہے۔ حتی کہ سیسے سے بھی زیادہ۔ سب دھاتوں سے زیادہ قیمتی ہے ' حتی کہ سونے چاندی بلکہ لعل اور الماس سے بھی زیادہ۔ ریڈیم ' نیچرکے خزانے کا سب سے زیادہ بیش قیمت جواہر ہے۔ یہی وہ پارس ہے جس کے عشق میں قدیم فلاسفہ اور حکماء دیوانے ہورہے تھے اور سمجھتے تھے ' اس کے ذریعہ ہر دھات سونا بن جاسکتی ہے ! "

ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ اسے بھی قصیدہ خواں پاؤ گے۔ وہ کہے گا " یہی وہ اکسیر حیات ہے جس کی مدتوں سے تلاش تھی۔ یہ عنقریب دنیا کی جملہ بیماریوں کا تریاق بننے والا ہے۔ "

سائنس داں سے سوال کرو۔ فوراً بول اٹھے گا " یہ سب سے زیادہ عجیب چیز ہے جو دنیا نے دیکھی ہے۔ یہ اسی کے خواص کی برکت ہے کہ ذراتی ترکیب (ایٹم) کا نظریہ قائم ہوسکا ہے جو عنقریب تمام علوم میں عظیم الشان اور حیرت انگیز انقلاب پیدا کردے گا۔ "

عالم طبقات الارض (جیالوجی) سے مخاطب ہو۔ وہ فوراً کہے گا " ریڈیم 'آتش فشاں پہاڑوں اور زمین کی اندرونی حرارت کا بہترین مفسر ہے۔ "

عالم فلکیات سے دریافت کرو۔ وہ کہے گا " ریڈیم ' آفتاب اور ستاروں کے نور و حرارت کا سرچشمہ اور ان کی قوت کا راز ہے۔ "

علم الحیات (بیالوجی) کا ماہر تو یہاں تک کہدے گا " شاید ریڈیم ہی زندگی کا اصلی منبع ہے۔ "

علم ہندسہ کا عالم کہے گا " اگر ریڈیم کی کافی مقدار حاصل ہوجائے تو اتنی عظیم الشان قوت انسان کے قبضہ میں آجائے جس کا اس وقت تصور بھی مشکل ہے ۔ ایسے حیرت انگیز آلات ایجاد ہوجائیں جن کے مقابلہ میں موجود ہ آلات بالکل ہیچ ہیں ۔ وہ آلات ایسے محیرالعقول کام کرسکیں گے جن کا عشر عشیر بھی حال کے آلات سے ممکن نہیں۔ پھر صنعت و حرفت میں بھی بالکل کایا پلٹ ہوجائے گی ۔ ابھی ریڈیم کی جتنی قلیل مقدار موجود ہے ' وہی بے شمار فوائد پہنچا رہی ہے ۔ اس کا ایک ادنی 'کرشمہ یہ ہے کہ اس سے ایک ایسا روغن ایجاد ہوگیا ہے جو گھڑی کی سوئیاں ' بحری اور ہوائی جہازوں کے آلات اور برقی کنجیاں ' اندھیری راتوں میں روشن رکھتا ہے ۔ قیمتی جواہرات اس سے تیار ہوجاتے ہیں ۔ اگر کچھ مدت کے لیے سفید (بے رنگ) یاقوت ' ریڈیم کے زیر اثر رکھ دیا جائے تو ہمیشہ کے لیے زمرد بن جاتا ہے ۔ نقلی اور مصنوعی نہیں ۔ حقیقی' بیش قیمت زمرد ! "

کبوتروں کی نامہ بری پر مولانا کا ایک طویل مضمون 1902ء میں '' خدنگ نظر'' میں دو اقساط میں شائع ہو چکا ہے جس میں تاریخی پس منظر میں اس پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔ بیسوی صدی کی ابتدا میں بھی جنگ اور امن دونوں ہی صورتوں میں کبوتروں کو نامہ بری کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے ۔ ترقی یافتہ یورپی ملک فرانس میں اس مقصد کے لئے کبوتروں کی تربیت کی جاتی رہی ہے ۔ ایک اطلاع کے مطابق 1914ء میں 28 فوجی کبوتر خانے تھے جن میں یہ امور طے پاتے تھے ۔ اس کا تذکرہ مولانا آزاد کے مضمون '' نامہ بر کبوتر'' میں آیا ہے جو 10 جون 1914 کے الہلال میں شائع ہوا تھا :

"یہ کیسی عجیب مگر دلچسپ بات ہے کہ جو کام آج انسان بجلی اور بھاپ کی حیرت انگیز قوتوں سے لینے پر نازاں ہے وہ کسی زمانے میں ایک نہایت معمولی اور حقیر جانور سے لیا جاتا تھا اور جب کہ ریل کی گاڑیاں ڈاک کے تھیلے لے کر نہیں جاتی تھیں اور تار

کے سلسلوں کے دور دراز ملکوں میں باہم خبر رسانی کو اس طرح آسان نہیں کردیا تھا ' تو نامہ بر کبوتروں کے غول تھے ' جو اپنی نازک نازک گردنوں میں خطوط کی امانت لے کر اور بڑے بڑے میدانوں اور دریاؤں پر سے گزر کے مکتوب الیہ تک پہنچتے تھے ' اور جس طرح آج تار برقی کے ہر جگہ اسٹیشن ہیں ' بالکل اس طرح ابن بے زبان پیام بروں کے اڑنے اور اترنے کے لیے بلندیوں پر اسٹیشن بنائے جاتے تھے !

نامہ بر کبوتروں کا وجود عہد قدیم کی ایک نہایت مشہور اور بڑی ہی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کا سلسلہ نصف صدی پیشتر تک بڑی بڑی آبادیوں میں جاری تھا۔ اب بھی دنیا سے بالکل مفقود نہیں ہوا ہے۔ بڑی بڑی لڑائیوں اور جنگی حصاروں کے زمانے میں ان سے کام لینا پڑتا ہے جب نئی دنیا کی بڑی بڑی قیمتی اور مغرورانہ ایجادیں کام دینے سے بالکل عاجز ہوجاتی ہیں۔ حکومت فرانس نے تو اب تک ان کے باقاعدہ اہتمام اور پرورش کے کام کو باقی و جاری رکھا ہے !

ان امانت دار پیامبروں نے دنیا میں خبر رسانی کی عجیب عجیب خدمتیں انجام دی ہیں اور احسان فراموش انسان کو بڑی بڑی ہلاکتوں سے بچایا ہے۔ جہاں انسان کی قوتیں کا م نہ دے سکیں ' وہاں ان کی حقیر ہستی کام آگئی !"

الہلال کے شمارے مورخہ 14 و 21 اکتوبر 1914ء میں " تارپیڈو " کے زیر عنوان ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں مولانا نے مشہور انگریزی اخبار " گلوب " کے حوالے سے تفصیلات فراہم کی تھیں ۔ تارپیڈو کی ہیئت و ماہیت اور انہیں پانی کے جہازوں کو نشانہ بنانے کے لئے آبدوزوں سے کس طرح داغا جاتا ہے' اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

"انسان کی جنگی ایجادات کا عجب عالم ہے ! جب کبھی وہ کوئی تباہ کن شئے ایجاد کرتا ہے تو ایک ایسی ایجاد کی فکر میں

سرگرداں رہتا ہے جو اس برباد کن آلہ کے مقابلہ میں سپر کا کام دے۔ علی ہذا جب کبھی وہ کوئی محافظ شے ایجاد کرتا ہے تو اس کو یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ کوئی ایسی شے ایجاد کیجیے جو اس محافظ آلہ کو بیکار کردے۔

انسان نے دشمن کے حملے سے محفوظ رہنے کے لیے آہن پوش جہاز تیار کیے ' مگر کیا ان آہن پوش جہازوں میں بھی وہ محفوظ رہ سکا ؟ جہاں تک توپوں کی آتشباری کا تعلق ہے عام طورپر انگریزی ماہرین بحریات کی رائے ہے کہ درع یا وہ غلاف آہنی جس میں جہاز ملفوف ہوتا ہے ' توپوں کی آتشباری کے مقابلہ میں بالکل بے کار ہے۔

لیکن جب توپوں کے بدلے تار پیڈو کا نام آتا ہے تو یہ مسئلہ اور بھی نازک ہوجاتا ہے۔ "

تار پیڈو کے متعلق جانکاری دینے کیلئے انہوں نے "گلوب" کے ایک مضمون کا یوں حوالہ دیا ہے :

" مشہور اخبار " گلوب " کا ایک مضمون نگار لکھتا ہے :

تار پیڈو کیا ہے ؟ اس کے متعلق اس وقت تک اچھے خاصے پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں میں بھی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ تار پیڈو میں جہاز کا عملہ بھی ہوتا ہے اور وہ کوئی خاص طرح کی آبدوز کشتی ہے۔ حالانکہ اس کی کچھ بھی اصلیت نہیں۔ تار پیڈو دراصل ایک پروجیک ٹائل ہے۔ (پروجیک ٹائل کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتاہے جو آگے کی طرف پھینکی جائے۔ خواہ وہ پتھر کا ٹکڑا ہو یا لوہے کی گولی یا کوئی اور شئے) اس میں اور توپ کے گولوں میں یہ فرق ہے کہ توپ جب گولہ پھینکتی ہے تو وہ اوپر کی جانب جاتا ہے۔ اگر اس کی زد طویل ہوتو 25 سو فیٹ تک بلند ہوسکتا ہے اور پھر نشانہ پر لگنے کے لیے نیچے کی جانب اترتا ہے۔

لیکن تار پیڈو کی حالت اس سے مختلف ہے ۔ وہ تار پیڈو کی نلکی کے ذریعہ یا کسی اور طریقے سے پھینکا جاتا ہے ۔ مگر توپ کے گولے کی طرح اوپر کی جانب نہیں جاتا بلکہ نکل کے تھوڑی دیر ٹہر جاتا ہے اور اس کے بعد پانی کے اندر ہی اندر چلا جاتا ہے۔ پانی کے عمق کی مقدار پھینکنے والے کی رائے و تجویز پر موقوف ہے ۔ وہ جس قدر عمیق پانی میں چاہے تار پیڈو کو لیجاسکتا ہے اور اپنا کام انجام دے سکتا ہے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ صرف پھینکنے والے کا ارادہ ہی اس بارے میں کافی نہیں ہے ' بلکہ اس کے ساتھ خود تار پیڈو کی ساخت میں بھی اس کی رفتار و عمق کی پوری استعداد ہونی چاہیے۔ اگر اس کی مشین اس طرح نہیں بنائی گئی ہے کہ وہ مختلف درجہ کے عمق میں تار پیڈو پھینک سکے تو تار پیڈو پھینکنے والے کا محض ارادہ کچھ نہیں کرسکتا ۔ "

''اکتشاف و اختراع'' موضوع کے تحت تین عنوانات'' وائرلیس ٹائپ رائٹر'' ' '' کہربا اور خزائن الارض'' اور'' خورد بینی دوربین'' پر 29 جولائی 1914 کے الہلال میں نوٹس شائع ہوئے تھے۔'' کہربا اور خزائن الارض'' میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ بغیر کھدائی کے کس طرح برقی رو کی مدد سے زمین کی ساخت' اس کے اندر بہنے والے چشموں اور مدفن خزانوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ وائرلیس ٹائپ رائٹر کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

" وائر لیس " اور " ٹائپ رائٹر " علحدہ علحدہ کوئی نئی شئے نہیں ہیں ۔ آپ ان دونوں سے اچھی طرح واقف ہیں ۔ وائر لیس بے تار کی خبر رسانی کو کہتے ہیں جس کی "لاسلکی " کے نام سے ہم بارہا معرفی کرچکے ہیں ۔ البتہ ان دونوں کا مجموعہ یعنی " وائر لیس ٹائپ رائٹر " ایک تازہ ترین اختراع ہے جس کو خود یورپ میں بھی لوگوں نے اس وقت تک صرف اخباروں کے صفحات میں دیکھا ہے۔

وائر لیس ٹائپ رائٹر ایک مشین ہے ' جس کا کام یہ ہے کہ لاسلکی کے ذریعہ جو پیغام آتا جائے وہ ساتھ قلم بند بھی ہوتا جائے اور اس طرح چھپتا جائے ۔ جس طرح ٹائپ رائٹر مشین میں چھپ جاتا ہے ۔ "

خورد بینی دور بین کی ایجاد' اس کے کام کرنے کا طریقہ اور اس کے استعمال پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ خوردبین اور دوربین کے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" خوردبین " اور " دور بین " دونوں کے فرائض علحدہ علحدہ ہیں ۔ خورد بین کا کام یہ ہے کہ وہ چھوٹی شے کو بڑا کرکے دکھاتی ہے ۔ دور بین سے دور کی شے بڑی ہوکر نظر آتی ہے ۔ کچھ عرصے سے یہ کوشش ہورہی تھی کہ ایسا جامع آلہ تیار کیا جائے جس سے دونوں کام لیے جاسکیں ۔

چنانچہ ایک ایسی دور بین تیار ہوگئی ہے جو خوردبین کا کام بھی دے سکتی ہے ۔ اسے (Davon Micro-telescope) کہتے ہیں۔ ہم نے اس کا نام " خوردبینی دور بین " تجویز کیا ہے ۔

ڈاوڈ اینڈ کمپنی نے جو دور بین اس وضع کی بنائی ہے اس میں ایک خاص اضافہ اور بھی کیا ہے ۔ یعنی بعض شیشے ایسے لگادیے ہیں کہ خواہ ستارہ کتنا ہی بے رخ ہو ' مگر دور بین سے دیکھنے والا (راصد) اپنی نشست بدلے بغیر ہی اسے دیکھ سکے گا ۔ "

جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے کہ الہلال کے شماروں میں علمی اصطلاحات پر سلسلہ وار مضامین شائع ہوئے ہیں جس میں مولانا آزاد نے اردو میں سائنسی اصطلاحات پر کھل کر بحث کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ عربی زبان میں الفاظ کا اتنا کچھ ذخیرہ موجود ہے جو اردو کے لئے اصطلاحیں فراہم کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں 15 اکتوبر 1913ء کے الہلال میں " عربی زبان اور علمی اصطلاحات " کے زیر عنوان مضمون میں مولوی المکارم عبدالوہاب صاحب کی اصطلاحوں پر توجہ دہانی کا جواب دیتے ہوئے مولانا آزاد ارشاد فرماتے ہیں :

”آپ کے ذوق علمی اور توجہ فرمائی کا شکریہ۔ ” مسئلہ وضع اصطلاحات “ کے چھیڑنے سے مقصود یہی ہے کہ اس شورش فتنہ زا کو خاموش کیا جائے جو دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتی ہے کہ اردو میں علوم حدیثیہ و فنون جدیدہ کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا رونا صرف اسی کا نہیں کہ اردو کادائرہ زبان و مصطلحات تنگ ہے ' بلکہ رونا اس کا ہے کہ ہمارے دوستوں کا میدان علمی تنگ ہے !

کیا عجیب بات ہے کہ اردو زبان کی یتیمی و بے کسی پر اس وقت ماتم کیاجارہا ہے حالانکہ نادان ماتم کرنے والوں کی کوتاہ نظری ماتم کی زیادہ مستحق ہے۔ وہ نہیں دیکھتے کہ عربی زبان ام الغات اسلامیہ ہے۔ زندہ ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیے کافی اسباب و سامان اپنے پاس رکھتی ہے۔

لوگ معترض ہیں کہ مصطلحات اردو کے لیے عربی زبان کی مراعات استحقاق پر کیوں زور دے رہا ہوں ؟ یہ کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ حتی الامکان عربی ہی کے الفاظ اردو کی ادبیات علمیہ میں استعمال کیے جائیں ؟ لیکن شاید یہ نکتہ ان کی نگاہ سے مخفی ہے کہ صرف عربی ہی نہیں بلکہ ہر علمی زبان اپنی ماتحت زبانوں کے لیے ایسے ہی حقوق کا مطالبہ رکھتی ہے۔

دنیا کی تمام موجودہ زبانیں دو قسم کی ہیں : اصلی اور فرعی :

اصلی سے مقصود وہ زبانیں ہیں جو دوسری زبانوں کی پیدائش و خلقت کے لیے خمیر و عنصر ہیں ' مثلاً عربی ' سنسکرت ' لاطینی ' یونانی۔

فرعی ان زبانوں سے عبارت ہے جن کی ترکیب و خلقت صرف ایک یا متعدد السنہ اصلیہ سے ہوئی ہے۔

حسب استمرار عادت لغویه جس طرح السنہ فروعیہ اپنے عام الفاظ و کلمات میں السنہؑ اصولیہ کی محتاج ہیں ' اسی طرح اصطلاحات علوم اور مصطلحات فنون میں بھی وہ ان کی موہبت و فیاضی کی دست نگر ہیں ۔ غور کیجیے کہ تمام یورپین زبانیں با ایں ہمہ کثرت اختراعات و وسعت علوم ' اپنی اصطلاحات میں لاطینی و یونانی الفاظ کی مقروض ہیں اور آج بھی کہ بیسویں صدی ہے ' یورپ میں جب کوئی علم ' فن ' مسئلہ ' یا آلہ نیا وضع ہوتا ہے تو اس کے تسمیہ کے لیے لندن'پیرس اور برلن کی زبانوں کی جدید ڈکشنریوں کے طرف مراجعت نہیں کی جاتی بلکہ روما کے اور اتھنز کے بوسیدہ صفحات لغت کی طرف ۔

یہی حال سنسکرت اور اس کی فرعی زبانوں کا ہے ' آج بنگلہ ' گجراتی اور مرہٹی زبانوں میں وضع اصطلاح کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت ہی کے الفاظ ہر جگہ ان مفلس گدا گروں کا کچکول سوال پر کرتے ہیں ۔

اصطلاحات حدیثہ کا سوال جانے دیجیے ' مسلمان آج تمام اطراف عالم میں پھیلے ہیں ۔ ان کی زبان ہر جگہ ایک نہیں ' لیکن مصطلحات دینیہ و علمیہ اب تک ایک ہیں اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ پھرکوئی سبب نہیں کہ تیرہ سو برس کا استحقاق آئندہ کے لیے اس سے سلب کرلیا جائے ۔

(1) ضرور ہے کہ وضع و تسمیہ اصطلاحات میں عربی زبان کے ثقیل ' معلق اور نادرالاستعمال الفاظ استعمال نہ کیے جائیں کہ یہ خود عربی کے لیے بھی بار ہیں ' پھر دوسری فروعی زبانوں کا کیا سوال ۔

(2) الفاظ مصطلحہ حتی الوسع مختصر اور چھوٹے ہوں کہ زبانوں پر بآسانی رواں ہوسکیں ' بڑے بڑے فقروں کو الفاظ

مصطلحہ قرار دینا خلاف آئین وضع اصطلاح ہے۔

(3) اکثر حضرات وضع اصطلاح میں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسری زبان میں اس اصطلاح کا جس قدر مفہوم ہے وہ بتمامہ اردو میں منتقل کرلیا جائے۔ اس سے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں یا تو ان کو اردو کی قلت ثروت و تنگ دامانی کی شکایت ہوتی ہے کہ اس میں ادائے مفہوم کی قدرت نہیں ' جیسا کہ اکثر احباب اس کے شاکی ہیں اور یا پھر حسب وسعت مفہوم الفاظ کثیرہ میں اپنامفہوم ادا کرنا پڑتا ہے۔"

اس طرح" الہلال" میں مولانا آزاد اور دوسرے مضمون نگاروں کے شائع شدہ مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس کا شائد ہی کوئی شعبہ ایسا رہ گیا ہو جس کے بنیادی اصولوں' نظریات اور کلیات پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو تا کہ اردو کے قارئین ان سے آگہی حاصل کرسکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جنہوں نے بھی ان مضامین کا مطالعہ کیا ہوگا ان کے ذہن کے دریچے ضرور وا ہوئے ہوں گے اور ان میں سائنسی طور پر سوچنے سمجھنے کے رجحان کو فروغ ملا ہوگا۔ اور اس طرح مولانا آزاد کو اردو والوں میں سائنسی علوم کو عام کرنے میں ضرور کامیابی ہوئی ہوگی۔

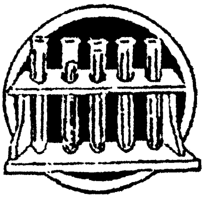
البلاغ

" الہلال" کی اشاعت کے پہلے دور کے اختتام کے بعد مولانا آزاد نے ایک سال تک نہ تو کوئی اخبار نکالا اور نہ ہی کسی اخبار سے وابستہ رہے۔ ان کی زیر ادارت" البلاغ" کا پہلا شمارہ 12 نومبر 1915 کو جاری ہوا مگر اس کی اشاعت بہت جلد یعنی 31 مارچ 1916ء کو بند ہوگئی۔ بظاہر 'البلاغ' ہفتہ وار 'الہلال' کا ہی ایک سلسلہ تھا جو نئے نام سے اردو دنیا میں متعارف ہوا تھا۔ اس میں مستقل کالم کے عنوانات وہی ہوا کرتے تھے جو الہلال میں ہوتے تھے۔ چنانچہ" مذاکرۂ علمیہ" بھی اس میں برقرار رہا جس کے تحت" نیند کی حقیقت" "" ایک نئی زمین کا انکشاف" اور" التحول الفجائی (Mutation)" جیسے سائنسی موضوعات پر مضامین جو ترتیب وار علم طب' علم جغرافیہ اور علم حیاتیات کا احاطہ کرتے تھے' شائع ہوئے۔

البتہ اس ہفتہ وار میں ''مذاکرہ علمیہ'' کی سرخی کے دونوں جانب سائنسی آلات کی تصویریں چھپنے لگیں۔ سیدھی جانب مرکب خوردبین (Compound Microscope) کے ساتھ مائع بھرا ایک قرنبیق (Retort) اور بائیں جانب لکڑی کے اسٹانڈ پر پانچ عدد امتحانی نلیاں (Test Tubes) جن میں دو نلیاں خالی اور تین میں مختلف مقدار میں محلول بھرا ہوا ہوتا۔ یہ دونوں تصویریں اس کالم کے تحت شائع ہونے والے سائنسی مضامین کی منہ بولتی تصاویر ہوا کرتیں۔ تصویروں سے مزین یہ کالم دوسرے دور میں شائع ہونے والے ''الہلال'' میں بھی برقرار رہا۔



مذاکرہ علمیّہ



ہفتہ وار البلاغ کی الہلال سے تمام تر یکسانیت کے باوجود خورد بینی بصارت اور دور بینی بصیرت رکھنے والوں نے دونوں ہی اخباروں میں فرق تمیزی محسوس کیا۔ چنانچہ نیاز فتح پوری نے اپنے مقالہ'' مولانا آزاد کی صحافتی عظمت'' میں ان کا تقابل کیا خوبصورت انداز میں کیا ہے :

" الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا تیور وہی تھے لیکن رخ دوسرا تھا ' انداز قد وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا ۔ الہلال نفسیات عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا ' الہلال حرکت و عمل ' جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا ' الہلال کا پیام تھا :

" شیر شو ' شیرانه در صحرائے شیراں پائے نہ "

اور البلاغ کا : "جلوہ برخودکن و خود رابہ لگا ہے دریاب "

الہلال ۔ خون منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوت دار و رسن ' البلاغ بشارت روحانی تھی اور پیام طاغوتیت شکن ۔

الہلال ۔ عرفی کی زبان میں نوید سرفروشی تھا کہ

برو پیالۂ خونین بحز زقصاباں

مشوگدائے شبانان که شیرمی دوشند

اور البلاغ ۔ بیدل کی زبان میں پیام تھا ۔ " خونے به جگر جمع کن و بروں آ " کا الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا ۔ ایک بے باکانه اعلان که

نازک دلان باغ تو چوں چشم سحر

بر روے برگ گل شکنند آبیگنه ہا

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا که

دل گم گشته سراغے ست زکیفیت شوق

نشه بالا اگر از دست رود شیشه ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا که الہلال نے دامن کتاں چاک کیا اور البلاغ نے اس چاک سے نظاره پر توماه کی دعوت دی ۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک ایسا رنگین دسته گل تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قدر اول کا میگزین بھی ‘ جس میں سیاسی مقالات ‘ علمی و تاریخی مضامین ‘ مذہبی و ادبی مباحث ‘ مطائبات ‘ منظومات الغرض وه سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوق انسانی آسوده ہو سکتا ہے ۔اورجو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پرہونا ممکن نہیں اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیاده تر مسلمانوں سے تھا تاکه ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کرکے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور سمجھ سکیں که اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی کے سوا کچھ نہیں اور جو ماوراء دیر و حرم " ہرجاکنیم بداں آستاں رسد " کا مبلغ ہے ۔ "

(آئینہ ابوالکلام ۔ عتیق صدیقی ۔ ص 84-85)

''البلاغ کے پہلے شمارے مورخہ 12 نومبر 1915ء میں مولانا آزاد کا ایک مضمون'' نیند کی حقیقت'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں نیند اور اسکی ضرورت اور حقیقت پر مختلف مکاتیب خیال کے نظریات اور ان کی تحقیقات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ جسم کی فزیالوجی اور کیمیاء کوملحوظ رکھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ صحت مند زندگی کے لئے نیند کتنی اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا آزاد اپنے اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم خواب غفلت کا زمانہ تھا جس میں نیند کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ ہمارے لئے کیوں ضروری ہے؟ جیسے سوال کسی کے ذہن میں ابھر ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن عصر حاضر جیسے بیداری کے زمانے میں ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ضرور اٹھتے ہیں اور اس کا تشفی بخش جواب مل نہیں پاتا۔ اس مضمون میں نیند کی طبیعی' کیمیاوی' طبی اور دیگر ضرورتوں کے پیش نظر مختلف مکاتیب خیال کے ماہرین کی آرا کو مدنظر رکھ کر تفصیل کے ساتھ نیند کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ماہرین کے ایک گروہ کا یہ ماننا تھا کہ دماغ کو خون کی کثرت سے فراہمی نیند کا موجب بنتی ہے جب کہ دوسرے گروہ کا خیال اس کے بالکل مغائر تھا۔ لیکن تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ دماغ کو فراہم ہونے والے خون کی مقدار میں کمی یا زیادتی سے نیند کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بات کو مزید تقویت دینے کے لئے قرآنی آیت کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ مضمون کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہے :

''اعضاء انسانیه میں ہر عضو کا وظیفه طبیعیه مختلف ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے ' کان سنتا ہے ' ہاتھ چھوتا ہے ' ناک سونگھتی ہے ' زبان چکھتی ہے ' دماغ سونچتا ہے ' وغیرہ وغیرہ ۔ انہی وظائف کے اختلاف سے ان اعضاء کے ملذذات و مرغوبات میں بھی اختلاف پیدا ہوجاتا ہے ۔ آنکھ خوش رنگ پھولوں سے لطف اٹھاتی ہے ۔ کان کو نغمہ ہائے شیریں خوش گوار معلوم ہوتے ہیں ۔ ہاتھ نرم اور چکنی سطح پر پھیلنا چاہتا ہے ۔ ناک کو بوئے عطر سے مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ زبان کو غذائے لطیف سے ذوق ہے ۔ دماغ دل خوش کن خیالات سے جی بھلاتا ہے ۔ لیکن ہدو سکون اور آسایش و راحت خدا کی ایسی نعمتیں ہیں جن کے ساتھ تمام اعضاء کو یکساں دلبستگی ہے۔

بظاہر انسان کے بعض متیقظ (بیدار) اعضا ہمیشہ اپنے

وظائف میں سرگرم عمل رہتے ہیں ۔ دل ہمیشہ متحرک رہتا ہے ۔ شرائین کی حرکت ہمیشہ جسم میں تر و تازہ خون پہونچایا کرتی ہے ۔ آلات تنفس کبھی معطل نہیں رہتے ۔ لیکن درحقیقت ان کو بھی سکون و آرام کی ضرورت ہوتی ہے ۔ چنانچہ نبض کا ہر وقفہ دل کے غیر منقطع سفر کی منزل ہے جہاں وہ آرام لیتا ہے۔ شرائین کے اعمال بھی ہمیشہ یکساں سرگرمی کے ساتھ جاری نہیں رہتے بلکہ ان میں بھی کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے اور اس وقت ان نازک رگوں کی دوڑ دھوپ بھی خدا کے اس فیض عام سے متمتع ہوتی ہے !

نیند اسی ہد و تام اور سکون کامل کا نام ہے ' اس لیے وہ اعضاء انسانیہ میں ہر عضو کو محبوب ہے اور اس قدر محبوب کہ اس کے لطف وصل کو رشک و رقابت منغض نہیں کرسکتے ' پس اس سے ہر عضو ایک ساتھ فائدہ اٹھاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بستر خواب سے اٹھنے کے بعد تمام قویٰ جسمانیہ کی تجدید ہوجاتی ہے ۔ جسم کے جو پرزے چلتے چلتے گھس گئے تھے ' وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں اور تمام اعضاء ایک مسرت تازہ ' ایک نشاط نو ' ایک انبساط جدید سے مسلح ہوکر اپنے وظائف طبیعیہ کے لیے از سر نو تیار ہوجاتے ہیں :

الم یروانا جعلنا الیل لیسکنرا فیہ والنہار مبصرا ان فی ذالک لایات لقوم یومنون (87:27)

کیا حکمت و ربوبیت کی اس نشانی کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے تاریکی کو تو رات قرار دیا تا کہ انسان سوے اور راحت و سکون پائے ' پھر دن کو روشن کیا تاکہ وہ سکون کی جگہ حرکت میں بسر ہو ۔ بلاشبہ ارباب ایمان و یقین کے لیے اس اختلاف لیل و نہار اور اس کے اثرات میں حکمت ربانی کی بڑی ہی نشانیاں ہیں ! "

'البلاغ' کے شمارہ 10 مارچ 1916 میں مولانا آزاد کے مضمون ''التحول الفجائی'' (Mutation) کی پہلی قسط اور 31،24،17 مارچ 1916ء کے شماروں میں دوسری قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ اس میں حیوانات اور نباتات میں پائے جانے والے نمایاں فرق کو واضح کرتے ہوئے اجزائے مشترک پر بحث کی گئی۔ یوں تو دنیا میں پائے جانے والے مختلف انواع کے حیوانات اور مختلف قسموں کے نباتات میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک حیوان دیکھنے میں دوسرا نظر آتا ہو اور ایک پھل کو دیکھنے پر دوسرے کا گمان ہوتا ہو۔ اتنے نمایاں فرق کے باوجود مختلف جانوروں کے درمیان اور مختلف نباتاتی اشیا جیسے پھل، پھول اور پودوں میں اجمالی طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ تحول کے معنی کسی چیز میں ایسا تغیر عمل میں آتا ہے کہ وہ دوسری چیز سے بالکل الگ ہو جائے اور فجائی کے معنی اچانک کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح التحول الفجائی سے مراد اچانک ہونے والا تغیر ہوتا ہے۔ اس مضمون میں حیوانات کے تنازع للبقاء (Struggle for Existance)، انتخاب طبیعی (Natural Selection) اور بقاالصلح (Survival of the Fittest) جیسے اصولوں کو مثالوں کی مدد سے تفصیل کے ساتھ سمجھاتے ہوئے ان کی تشریح بڑے ہی دلچسپ انداز میں کی گئی ہے:

> ''تمام اجسام موثرات خارجیه ' موسم ' غذا ' طرز بود ماند وغیره سے متاثر ہوتے ہیں۔
>
> برفستان کے باشندے گورے برف کی طرح سفید ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی انسان کسی تپتے ہوئے گرم ریگستان میں رہنے لگے تو اس کا رنگ خراب ہو جائے گا ' تاہم صباحت قائم رہے گی۔ چند نسلوں کے بعد یہ صباحت ملاحت سے بدل جائے گی۔ ایک زمانے کے بعد نسلیں سبزہ رنگ ہونے لگیں گی۔ اس کے بعد پھر سیاہ فام۔ جن خاندانوں کے پیشرو برف کی طرح سفید تھے ' اب ان کی یادگاریں بھونرے کی طرح سیاہ ہیں۔
>
> موثرات خارجیه کی تاثیر کی یه ایک نہایت ساده اور عام الوقوع مثال ہے۔ رنگ کی طرح اعضا کی ساخت ' قویٰ بلکه نفس وجود تک اثر پذیر ہوتا ہے۔

شیر ایک درندہ ہے ۔ قدرتاً اس کے پنجوں میں ناخن اور دانتوں میں کچلیاں ہوتی ہیں ۔ یہ ناخن اور کچلیاں تیز اور زود شگاف ہوتی ہیں ۔ لیکن فرض کرو کہ شیروں کی ایک جماعت کسی ایسے جنگل میں پہنچ جائے جہاں اسے گوشت نہ ملے تو کیا ہوگا ؟ اکثر تو مر جائیں گے ۔ کچھ ایسے سخت جاں ہوں گے کہ جی بچیں گے ۔ بھوک کی شدت ان کے لیے گھانس پتوں کو گوارا کردے گی ۔ وہ سبزی کھانا شروع کردیں گے۔ آنے والی نسلیں اسی عالم میں آنکھ کھولیں گی ' ان کے لیے یہ معمولی بات ہوگی ۔ ایک متعدبہ زمانے کے بعد تمام آلات و اعضاء سبعیت و درندگی یعنی بڑے بڑے دانت ' خونخوار پنجے ' قوی اور ہضم کن معدہ ' یہ سب کے سب بوجہ تعطیل و عدم استعمال از کار رفتہ ہوجائیں گے ' اور اسکے بعد یا تو یہ نسل ضعیف ہوتے ہوتے فنا ہوجائے گی یا باقی رہے گی مگر بالکل ایک نئے قسم کا شیر بن کر ۔

گوشت خور (Carnivora) جانوروں کی آنتیں چھوٹی ہیں اور نباتات خور جانوروں کی لمبی ۔ جب اس جماعت کی کئی نسلیں نباتات خوری کے عالم میں گذریں گی تو ان کی آنتیں بھی نباتات خور جانوروں کی طرح لمبی ہوجائیں گی ۔ آنتوں کی طرح وہ تمام اعضا بھی نشوونما پائیں گے ' جن کی نباتات خور زندگی میں ضرورت ہوتی ہے ۔

اب فرض کرو کہ اس خاندان کے چند اعضا کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں ان کو غذا صرف پانی میں مل سکتی ہو تو پھر کیا ہوگا ؟ سابق کی طرح یہ بھی اسی کے خوگر ہوجائیں گے ۔ اب وہ اعضاء بھی مضمحل و افسردہ ہوجائیں گے جو نباتات خوری کی زندگی میں بڑھے تھے ۔ جب کہ وہ زمین میں اپنی غذا ڈھونڈھتے تھے ۔ اور ان کے بدلے اب وہ اعضا بڑھیں گے جن کی ضرورت اسی تیسری زندگی میں ہوگی ۔

مختصراً یہ کہ جب غذا کا تغیر ایک عرصہ تک جاری رہتا ہے تو اس کے بعد اعضاء میں بھی تغیر ہو جاتا ہے ۔"

18 فروری 1916 کے البلاغ میں مولانا آزاد کا ایک مختصر مضمون بعنوان " ایک نئی زمین کا اکتشاف' دائرہ قطب شمالی'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ناروے کے ایک کم عمر سیاح جارج اسٹیفنسن کی مہم جوئی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس نے قطب شمالی تک پہنچنے کے لئے 1913ء میں سفر طے کیا تھا اور بلاخر 19 جون 1915 کو اس نئی زمین پر قدم رنجہ ہوا تھا۔ اس کا مقصد صرف قطب شمالی کو مسخر کرنا ہی نہیں تھا بلکہ وہاں پر علمی تحقیقات کا عمل میں لے آنا بھی اس کے پیش نظر رہا۔ چنانچہ اس نے اپنے اس مقصد میں ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ۔ بعد میں ماہرین ارضیات' نباتات' حیوانات اور طبیعیات نے اس قطعہ زمین کو موضوع تحقیق بنایا اور اس سے متعلق مکمل طور پر واقفیت حاصل کی ۔

مولانا آزاد کی سائنسی موضوعات پر اتنی ساری تحریریں اور سائنسی علوم کے فروغ کے لیے بذریعہ صحافت ان کی کاوشیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مولانا کا انداز فکر ونظر سائنسی تھا اور وہ ایک بلند سائنسی شعور کے مالک تھے۔

غبارِ خاطر

سائنس کے تناظر میں

1942ء کی بات ہے۔ ساری دنیا دوسری جنگ عظیم کے زیر اثر آ چکی تھی اور ادھر ہندوستان میں آزادی کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ اس تحریک کو مزید تیز کرنے کی غرض سے انڈین نیشنل کانگریس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ 8/اگست 1942ء کو بمبئی میں منعقدہ خصوصی اجلاس میں ایک قرارداد منظور کرے گی۔ منظوری کے بعد یہ قرارداد ''ہندوستان چھوڑ دو تحریک'' (Quit India Movement) کہلائی۔ انگریز یہ بات کب برداشت کرنے والے تھے۔ چنانچہ اس قرارداد کی منظوری کے ساتھ ہی پارٹی کے تمام سرکردہ قائدین کو 9/اگست کو علی الصبح سوتے میں بستروں سے اٹھا کر حراست میں لے لیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ انھیں بھی بشمول پنڈت جواہر لعل نہرو اور دیگر گیارہ رہنماؤں کے قلعہ احمد نگر میں قید کر دیا گیا۔ اپریل 1945ء میں انہیں بانکواڑہ جیل منتقل کیا گیا اور پھر 15/جون 1945ء کو ان کی رہائی عمل میں آئی۔ احمد نگر کا قلعہ اس لحاظ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ مولانا آزاد نے وہاں پر قید و بند کے زمانے میں جو خطوط لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھے تھے، ان کا انتخاب رہائی کے بعد ''غبارِ خاطر'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا اور پنڈت نہرو نے انگریزی میں جو کتاب لکھی تھی وہ Discovery of India کے نام سے شائع ہو کر شہرت پائی۔

اردو ادب میں 'غبار خاطر' ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس کے مواد اور متن پر' مولانا آزاد کے اسلوب اور نثر پر' مختلف ماہرین دانش و بینش نے مختلف انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ ساہتیہ اکیڈیمی کے زیر اہتمام شائع شدہ 'غبار خاطر' کے مرتب مالک رام اپنے مقدمہ میں اس تصنیف کی تفصیلات سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''غبارِ خاطر'' مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے، جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو یہ خطوط

کا مجموعہ ہے 'لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کوچھوڑکر' ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں، جنہیں خطوط کی شکل دے دی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس طرح کے مضامین لکھنے کا خیال ان کے دل میں شہرۂ آفاق فرانسیسی مصنف اور فلسفی چارلس لوئی مونٹسکیو کی مشہور کتاب "فارسی خطوط" (1721) سے آیا ہو۔ اس کتاب میں دو فرضی ایرانی سیاح...... اوزبک اور رجا...... فرانس پر عموماً اور پیرس کی تہذیب و تمدن پرخصوصاً بے لاگ اور طنزیہ تنقید کرتے ہیں' اسلام اور عیسائیت پر آزادانہ اظہار خیال کرتے ہیں، جو اس عہد کی خصوصیت تھی۔ اس میں کئی اور سیاسی اور مذہبی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ اس کتاب کا دوسری زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔

لیکن وہ ان باتوں کو الگ الگ مضامین کی شکل میں بھی قلمبند کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اس صورت میں تعلق کے فقدان کے باعث بعد کو انہیں ایک شیرازے میں یکجا کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ انہیں کسی شخص واحد کے نام خطوں کی شکل میں مرتب کردیا جائے۔ ان کے حلقۂ احباب میں صرف ایک ہستی ایسی تھی جو علم کی مختلف اصناف میں یکساں طور پر دلچسپی لے سکتی تھی۔ یہ نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کی ذات تھی۔ انہوں نے عالم خیال میں انہیں کو مخاطب تصور کرلیااور پھر جب کبھی' جو کچھ بھی' ان کے خیال میں آتا گیا' اسے بلاتکلف حوالۂ قلم کرتے گئے۔ انہیں مضامین یا خطوط کامجموعہ یہ کتاب ہے۔" (غبارِخاطر۔ص 8)

مالک رام کی یہ قیاس آرائی تھی کہ مولانا آزاد نے فارسی خطوط سے متاثر ہو کر قلعہ احمد نگر کی محرومی میں یہ خطوط لکھے ہوں گے، ضیاء الحسن فاروقی نے اپنی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد، فکر و نظر کی چند جہتیں" میں دلائل کی روشنی میں اس قیاس کو رد کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے:

" مَون ٹسکیو کے فارسی خطوط میں کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ اس سے مولانا آزاد جیسا عبقری جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی راہ آپ نکالنے کا شیدائی تھا، اس قدر متاثر ہو۔ یہ خطوط فارسی اس لئے ہیں کہ یہ خط و کتابت ہے چند ایرانیوں کے مابین جو یورپ کی سیاحت پر نکلے ہیں۔ یہ بھولے بھالے ایرانی سیاح مَون ٹسکیو کے ذہن کی پیداوار ہیں، ایک نئی طرز کی فکشن کے کردار جن کی زبان سے ان خطوط کا مصنف اٹھارہویں صدی کے یورپ کی معیشت و معاشرت پر تنقید اور بعض روایتی اداروں پر طنز کرتا ہے۔ ان خطوط کا لہجہ اور ان کے موضوعات کا رنگ بالکل مختلف ہے۔ ہم نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ غبار خاطر اور اسمیں کوئی مماثلت نہیں۔

غبار خاطر ایک دوسری نوعیت کی کتاب ہے۔ یہ بالکل واقعاتی نہیں ہے۔ اس کا لہجہ، فارسی خطوط کے برخلاف سنجیدہ اور مفکرانہ ہے اور اس کی زبان اور اسلوب بیان میں علم و ادب کی فنکارانہ گھلاوٹ ہے جس کی وجہ سے مولانا آزاد کی یہ تصنیف اردو نثر میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ غبار خاطر کے خطوط، چند کو چھوڑ کر، نجی خط و کتابت کی نوعیت کے نہیں ہیں۔ انہیں جیل کی تنہائیوں میں مولانا آزاد نے اپنے سکون خاطر کیلئے لکھا، ایسے متفرق عنوانات پر، جو ان کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا موضوع تھے یا رہ چکے تھے اور انہوں نے کچھ نتیجے نکالے تھے۔ شاید انہیں یہ خیال بھی ہو کہ جب کبھی یہ خطوط پڑھے جائیں گے تو پڑھنے والوں کو ان سے کچھ نہ کچھ بصیرت حاصل ہوگی اور غالباً اسی لئے

انہوں نے اپنی عارفانہ دانشوری کی تابانیوں کو جستہ جستہ کر کے، فکر و نظر کی راہوں میں بکھیر دینا چاہا ہوگا۔

قلعہ احمد نگر میں مولانا آزاد کے سامنے سوال یہ رہا ہوگا کہ قید خانے میں اپنا وقت کیسے گزاریں، ترجمان القرآن کی تکمیل کا کام وہاں ہو نہیں سکتا تھا، اسی طرح بیشتر اُن ہی اسباب کی بنا پر ان کے لئے کوئی تحقیقی اور علمی تصنیف ممکن نہیں تھی، ہاں وہ اپنے حافظہ کی مدد سے ایک حد تک اپنے سوانح حیات یا اپنے میموائرس قلمبند کرسکتے تھے، وہ یہ کام کر جاتے تو بڑا کام ہوجاتا، آزاد کی کہانی خود انہیں کے قلم سے، لیکن انہوں نے یہ نہیں کیا، البتہ قید خانے کی تنہائی میں، اپنی افتاد طبع کے تقاضے سے ہم آہنگ، انہوں نے اپنی زندگی کے بیتے دنوں کی کچھ یادوں کو تازہ کیا اور ماضی کی کئی باتوں کو کئی خطوط میں، کہیں مربوط اور کہیں جستہ جستہ، ایک خاص ادبی اسلوب میں پیش کیا، اور اسی کے ساتھ بعض خطوط میں انہوں نے اہم موضوعات سے متعلق اپنا نتیجہ فکر اور اپنے تاثرات بیان کئے۔ ان میں ایک خاص موضوع خود زندگی ہے، بلکہ اس بات کو یوں کہنا شاید زیادہ صحیح ہوکہ غبار خاطر کے متفرق موضوعات کا اصل سر رشتہ زندگی ہی ہے اپنی پیچیدگیوں، نیرنگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ۔"

(ص 104-105)

غبارِ خاطر، "ترجمان القرآن" کی اشاعت کے پندرہ سال بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اتنے بڑے عرصے میں مولانا کی طرزِ تحریر اور ان کے اسلوب میں کیا کوئی فرق پایا گیا یا نہیں؟ اس بات کا موازنہ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی کتاب "ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش" میں کیا خوب کیا ہے:

"اس پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتاہے کہ اس کی زبان و بیان اصلاً وہی ہے جو پندرہ سال قبل شائع ہونے والی کتاب

"ترجمان القرآن" کی ہے، گرچہ غبارِ خاطر میں نسبتاً رنگینی کلام اور شوخیِ ادا زیادہ نمایاں ہے۔ اس فرق کا سبب واضح ہے۔ غبارِ خاطر کلام اللہ کی ترجمانی نہیں ہے، صرف ایک عالم و فاضل، مفکر و مدبر اور متحرک و فعال شخصیت کے پیچ و خم پادرہو داغ و جستجو و آرزو کا اظہار ہے۔ بحیثیت فن کے لحاظ سے بھی تفسیر و مکتوب کے درمیان امتیاز بدیہی ہے۔ بہرحال مجموعۂ مکاتب میں بھی وہی سادگی و پُرکاری ہے جو تفسیرِ قرآن میں تھی۔ نثر آزاد کے نقطۂ عروج کی اس توصیف کا مفہوم پوری طرح آشکارا ہوجائے گا، اگر ترجمان و غبار کا موازنہ الہلال و تذکرہ سے کرلیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ غبارِ خاطر میں مولانا آزاد کے ذہن و قلم کا انبساط درجۂ کمال پر ہے، جب کہ اس انبساط کا اظہار و بیان جس طرز و اسلوب سے ہوا ہے وہ ترجمان القرآن ہی میں پختہ و محکم ہوچکا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ غبارِ خاطر ایک بندۂ خدا کا، اسی کے بہ قول "انانیتی" ادب ہے، جب کہ ترجمان القرآن میں خدا کا تکلم بندوں کے لئے تھا، مکاتیب میں ایک شخص دوسرے شخص کو خطاب کرتا ہے اور اس انداز سے کہ ساری اہمیت خطاب کرنے والے کی ہے، نہ کہ اس کی جس سے خطاب کیا گیا ہے، لیکن آیاتِ الٰہی کا خطاب خدا کی طرف سے اس کے تمام بندگان کے لئے ہے۔ اس فرق کی وجہ سے ترجمان میں لکھنے والے کی "میں" خدا کے "ہم" کی تابع ہے، مگر غبار خاطرمیں اس "میں" پر کوئی پابندی نہیں۔ اس فرق کے باعث خطوط کا ولولہ اور طنطنہ تفسیر میں سوز و گداز سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ یہ بہرحال لہجہ و آہنگ کا اختلاف ہے، نہ کہ متن و عبارت کا"۔

(ص 53)

مولانا آزاد کی شخصیت کے کئی ایک پہلو ہیں۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا تو جواب ہی نہیں۔ کون ہے جو ان کے طرز تحریر کا قائل نہیں ہے۔ خلیق انجم نے اپنی مرتبہ کتاب "مولانا آزاد، شخصیت اور

کارنامے'' میں غبارِ خاطر کے حوالے سے مولانا کی ان تمام خوبیوں کا اعتراف کیا ہے :

" جیل کی تنہائی میں مولانا آزاد کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ کتابوں پر پابندی ہونے کی وجہ سے مولانا مطالعہ کرسکتے تھے اور نہ ہی کسی مستقل موضوع پر کچھ لکھ سکتے تھے اور ان حالات میں دل کا غبار نکالنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ مکتوب نما انشائیے لکھے جائیں۔۔۔ مولانا کی شخصیت کے بہت سے پہلو تھے، وہ ایک عالم، مفسر قرآن، مدبّر، مفکر اور صف اول کے سیاستداں تھے، لیکن ان میں تخلیقی فن کار بھی پوشیدہ تھا۔ ایک ایسا فن کار جس میں انشا پردازی کی اعلیٰ ترین صلاحیتیں موجود تھیں۔ غبارِ خاطر کے مکاتیب میں مولانا کی ان صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ ان تحریروں میں مولانا کا اسلوب شعر منشور ہے۔ بہ قول محمد اجمل خان صاحب، نثر میں شاعری کیا کرتے تھے، ان کی تحریر از سرتاپا شعر ہوتی تھی۔ صرف ایک چیز اس میں نہیں ہوتی تھی، یعنی وزن ...... بڑی تعداد میں غبار خاطر کے خطوط نثری نظم کی تعریف پر پورے اترتے ہیں"۔

(ص 140-143)

غبارِ خاطر کی ادبی صنف کے تعین کے بارے میں ماہرین دانش وبینش میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ عصمت جاوید نے اپنے مقالہ'' مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش'' میں اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے:

"غبارِ خاطر کی ادبی صنف کا تعین بڑا مشکل ہے۔ اگر اسے خود کلامیہ سمجھیں تو بات نہیں بنتی کیوں کہ اس میں نہ تو سرگوشیوں والا انداز ہے اور نہ اپنے آپ سے تخاطب۔ اگر اسے ڈرامائی واحد کلامیہ **Dramatic Monologue** قرار دیں تو اس صنف میں فرضی مخاطب گفتگو میں حصہ لیتا ہے جیسے غالبؔ کے بعض خطوط اور رابرٹ براؤننگ کی اکثر نظموں میں، لیکن غبار

خاطر میں مخاطب بالکلیہ غائب ہے۔ اسے خود نوشت سوانح عمری بھی نہیں کہہ سکتے کہ خود نوشت میں سوانح، زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ اسے انشائیوں کا مجموعہ کہنا بھی مشکل ہے۔ صرف دو تین خطوط جیسے حکایت بادہ و تریاک، حکایت زاغ وبلبل، چڑیا چڑے کی کہانی، وغیرہ انشائیہ کے ذیل میں رکھے جاسکتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خود 'انشائیہ' کی تعریف کثرت تعبیر میں گم ہے۔ بہرحال غبارِ خاطر ایک کثیر پہلو تصنیف ہے۔ اس میں خطوط نگاری کا رنگ بھی ہے۔ خود نوشت سوانح کی جھلک بھی ہے، انشائیہ کا انداز بھی ہے۔ اگر ان تمام پہلوؤں پر مشتمل کوئی صنف ہوسکتی ہے تو غبار خاطر کے لئے وہی صنف طئے کیجئے "

(ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت۔ مرتبہ رشیدالدین خاں۔ ص 348)

غبارِخاطر میں مولانا آزاد کے اسلوب اوران کی انشاء پردازی کی خصوصیت پر احمد سعید ملیح آبادی اپنے مقالہ" مولانا آزاد کے چند اہم مسودات" میں لکھتے ہیں:

"غبارِ خاطر" کی ایک خاص بات یہ ہے کہ بیک وقت وہ ادب، تاریخ، ثقافت اور سیاست کا ایک حسین اور دل نواز پیکر ہے۔ اس کا اسلوب بیان، مولانا کی دوسری تحریروں سے بالکل جدا ہے۔ اس میں نہ 'الہلال' اور 'البلاغ' جیسی خطیبانہ گھن گرج اور کڑک چمک ہے، نہ تذکرہ، جیسے پر شکوہ الفاظ اور ترکیبوں کے آبشار گرتے اور گرجتے ہیں۔ یہ نسبتاً ایک عام فہم اور سلیس ادبی زبان میں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ہر اسٹائل سے لکھنے پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ وہ کسی ایک طرز انشاء کے موجد و مالک نہ تھے جس انشاء کو مولانا چاہتے اپنا لیتے اور وہ صرف ان کا ہوجاتا، اس کی کاپی کرنا بھی دوسروں کے لئے آسان نہ ہوتا"۔

(مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے۔ مرتب خلیق انجم۔ ص 366)

آل احمد سرور نے اپنے مقالہ ''مولانا آزاد کا اسلوب نثر'' میں غبارِ خاطر کو ایک ادبی کارنامہ قرار دیا ہے:

''غبارِ خاطر اس لحاظ سے ایک ادبی کارنامہ ہے کہ مولانا کی شخصیت، افتاد مزاج، اُن کے ذوق، اُن کی دلچسپیوں اور مشاغل، فلسفہ، مذہب، فنون لطیفہ، تاریخی معلومات کے متعلق اس میں بڑے دلکش اشارے ملتے ہیں۔ غبارِ خاطر کا اسلوب ہے تو صاحب ''الہلال'' کا ہی، الہلال کے اسلوب سے خاصا مختلف ہے۔ غبارِ خاطر میں معمولی واقعات سے زندگی کے قوانین اخذ کرنے، فطرت کے مظاہر میں زندگی کے ارتقا کے رموز دریافت کرنے، موسم کی تبدیلیوں، پھولوں کے رنگوں، پرندوں کی پروازمیں کائنات کے حقائق دیکھنے اور دکھانے کا ایک ایسا دفتر ہے جس کے ہر ورق سے ہمیں معرفت اور بصیرت کے کتنے ہی نکتے ہاتھ آتے ہیں''۔

(ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت۔ مرتب رشید الدین خان۔ ص 316)

حسرت موہانی مولانا آزاد کی نثر کے بڑے قائل تھے۔ اپنے ایک شعر میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا خوب کیا ہے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر — نظم حسرتؔ میں کچھ مزا نہ رہا

صدیق الرحمٰن قدوائی اپنے تحریر کردہ مقالہ '' جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر'' میں غبار خاطر کو مولانا آزاد کی نثر کا نقطۂ عروج قرار دیتے ہیں:

''غبارِ خاطر دراصل مولانا آزاد کی نثر کا نقطہ عروج ہے۔ جس نثر میں کبھی خطیبانہ گونج ہوا کرتی تھی، وہ اب خود کلامی اور خود کلامی کے بھیس میں ہم کلامی کی سرگوشیوں سے آشنا ہوئی۔ ان کے اسلوب میں شاعر کا تخیل اور مصور کا فن ہمکنار ہوگیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ انداز جس میں فارسی کی چاشنی، کلاسیکی صنعت گری اور بیسویں صدی کے آغاز کا رومانی مزاج باہم تحلیل ہوگیا تھا، وہ مولانا آزاد پر ختم ہوگیا۔ کیوں کہ ان سا

ادیب جس کے ہاں یہ سب عناصر اس تناسب کے ساتھ یک جا ہوجائیں، اب اردو میں شاید نہیں آئے گا۔ اس اعتبار سے ابوالکلام آزاد کا اسلوب نثر اردو ادب کی تاریخ میں ایک منفرد نقش بن کر ثبت ہوچکا ہے"۔

(ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت، مرتبہ رشیدالدین خان۔ ص 332)

ممتاز نقاد سید عبداللہ، مولانا آزاد کی علمیت اور عظمت کے بڑے قائل نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیق "انوارِ ابوالکلام" میں غبار خاطر کی نثر کو غیر معیاری قرار دیا ہے :

"غبار خاطر' ابوالکلام کی تصانیف میں اول درجے کی تصنیف نہیں۔ ان کے ادبی کارناموں میں غبار خاطر ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ابوالکلام کی اصل نثر سے بہت دور ہے۔ اس میں ابوالکلام کی تصویر بہت مدھم اور دھیمی ہے۔ اس میں ابوالکلام کا قلم بیمار اور ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ غبار خاطر ایک لحاظ سے بیکاری کا مشغلہ ہے۔ اس میں خیال نے فرضی مکتوب الیہ کے نام فرضی خط لکھوائے ہیں۔ اس کی اکثر بحثیں فرضی ہیں۔ البتہ فارسی اشعار کا انتخاب بہترین ہے جس پر ابوالکلام کے نوق کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ غبار خاطر جواں سال ابوالکلام کی تصنیف نہیں کہن سال ابواکلام کی تصنیف ہے"۔ (ص 87)

شکیل الرحمٰن اپنی تصنیف "ابوالکلام آزاد" میں سید عبداللہ کی تنقید پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اور غبار خاطر کو مولانا آزاد کے رومانی فکر و نظر کا حاصل قرار دیتے ہیں :

"اردو کے بعض تنقید نگار جب کسی وجہ سے لاشعوری دباؤ محسوس کرتے ہیں تو ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ایسی ہی نثر لکھتے ہیں 'غبار خاطر' مولانا کی "اصلی نثر سے بہت دور ہے" یہ اصلی نثر کون سی ہے؟ اسی مضمون میں بات واضح ہوجاتی ہے۔ مولانا کی اصلی نثر 'الہلال' کی نثر ہے 'غبارِ خاطر' اس

داعیہ عظیم اور جذبہ شدید سے بھی خالی ہے جس کے شعلے الہلال میں مشتعل ہو کر اقصائے ہند میں آگ لگا چکے تھے۔ تنقید نگار نے مولانا کی "بارعب" اور "پرجلال نثر" ہی کو ان کی اصل نثر سمجھ لیا ہے۔ الہلال کی صحافتی نثر اور غبار خاطرکے فنی اسلوب کو سمجھے بغیر اور یہ سمجھے بغیر کہ فنکاری کہاں ہے، رویہ اور میلان، مزاج اور رجحان اور موضوعات کے انتخاب کی کیفیت اور صورت کیسی ہے۔ تنقید نگار نے یہ فیصلہ صادر کردیا ہے کہ 'غبار خاطر' کی نثر مولانا کی اصلی نثر نہیں ہے، وہ غبار خاطرمیں بھی ایسی پرجلال نثر پانے کے متمنی تھے کہ جس میں قوت، توانائی، سخت کوشی اور دشوار پسندی ہو۔ غبار خاطرکے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کی مجموعی رائے یہی ہے "غبار خاطر ایک جوئے نغمہ خواں ہے جو حیات کے صنف اور ولولہ ہائے زندگی کی غنودگی کی ترجمانی کررہی ہے اس میں صد ہزار نوائے جگر خراش کا سماں پایا نہیں جاتا" ـــ نہیں جانتا کس حد تک اسے ادبی تنقید کا انداز اور اسلوب کہا جاسکتا ہے لیکن یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو کی ادبی تنقید آرٹ اور اس کے جوہر کے تئیں زیادہ بیدار نہیں ہوئی ہے۔ آرٹ کے شعور یا فنی شعور (Art Consciousness) کی کمی یقیناً محسوس ہوتی ہے۔ "لسان الصدق" اور "الوکیل" سے "الہلال" ، "البلاغ" اور "تذکرہ" تک اور "ترجمان القرآن "سے "غبار خاطر"تک مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نے ایک سفر کیا ہے، یہ ان کی نثر کی مختلف منزلیں ہیں کہ جن پر ان کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، ترجمان القرآن کے اسلوب کی جمالیات اور غبار خاطر کی رومانیت سے اردو نثر میں سبلائم اور جمال کا ایک عمدہ ء معیار قائم ہوتا ہے۔

یکسانیت سے گریزکا عمل بنیادی طور پر رومانی عمل ہے،

غبار خاطر کے مضامین مجموعی طور پر یکسانیت، ماحول کی شکست وریخت ، سیاسی اتھل پتھل اور انتشار سے گریز کے عمل کے غماز ہیں، اسی عمل میں مولانا ابوالکلام آزاد کے رومانی مزاج کی پہچان ہوتی ہے"۔ (ص 9-8)

رشید احمد صدیقی کا اپنا ایک الگ زاویہ نگاہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"قلعه احمد نگر کے ایام اسیری میں مولانا کا غبار خاطر لکھنا ایک دلچسپ مطالعه ہے۔ غبار خاطر کہنے کو تو مولانا کے خطوط ہیں اور نواب صدر یارجنگ مرحوم کے نام لکھے گئے ہیں لیکن مولانا آزاد کے انداز طبیعت کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر یہ محسوس ہوا جیسے مولانا نے یہ خطوط اپنے ہی نام لکھے ہوں اس لئے کہ یہ اتنے خطوط نہیں معلوم ہوتے جتنی خود کلامی، مولانا اپنے سوا کسی سے اتنے بے تکلف نہیں ہوسکتے تھے کہ اس کو ایسے خطوط لکھتے اپنے سے بھی مولانا بڑی مشکل سے بے تکلف ہوتے تھے"۔

(ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت۔ مرتبہ رشید الدین خان۔ ص 320)

مولانا آزاد نظر بندی کے زمانے میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی دلچسپی لینے کی کوشش کرتے جیسے عصمت جاوید نے اپنے مقالہ "مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش" میں یوں واضح کیا ہے:

"احمد نگر کے زمانه اسیری میں مولانا نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس حد تک دلچسپی لی ہے که شاید اس کے مواقع انہیں اپنی بے حد مصروف مجلسی زندگی میں اس سے قبل میسر نہیں آئے تھے۔ مولانا ہمارے عہد کی ایک قدآور شخصیت ہیں۔ کیا اس بات کا مطالعه ہمارے لئے کوئی دلچسپی کا سامان نہیں رکھتا که ایک بڑا آدمی زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں کے بارے میں کیا سوچتا ہے اور اس سے کیسے کیسے نتائج اخذ کرسکتا ہے؟۔ کہا جاتا ہے که ان خطوط میں مولانا نے

خود اپنا بت تراش کر اپنی پرستش کروانی چاہی ہے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب اس خط میں مل جائے گا جس میں مولانا نے انانیتی ادب کے بارے میں کھل کر گفتگو کی ہے۔ میری ناقص رائے میں مولانا کی انانیت جتنی بڑی تھی اتنی بڑی دوسروں کو بھی دکھائی دیتی ہے یا دکھائی دینی چاہئے۔"

(ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ جہت شخصیت۔مرتب رشید الدین خان۔ص 348)

مشہور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی، غبار خاطر کو تصنیف نہیں بلکہ ادبی تخلیق قرار دیتے ہیں:

"غبار خاطر، تصنیف نہیں بلکہ ادبی تخلیق ہے، غبار خاطر کا ابوالکلام واعظ اور خطیب نہیں ہے، یہاں ایک خاص رچاؤ سے اس کی شخصیت کا داعی اور اُپدیشک، فلسفی اور حامی مذہب، ادیب اور شاعر، مصّور اور مغنی ایک اکائی میں تبدیل ہوجاتا ہے، اس لئے اسے محض خطوط کا مجموعہ سمجھ کر پڑھنا بھی صحیح نہیں ہے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، فکر ونظر کی چند جہتیں۔ضیاء الحسن فاروقی۔ص120)

مولانا آزاد کے خطوط" غبارِ خاطر" کے علاوہ" کاروانِ خیال" اور" نقشِ آزاد" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ان تمام خطوط کے مطالعہ کی روشنی میں مولانا آزاد کی جو شخصیت ابھر کر آتی ہے اس کے بارے میں پروفیسر عبدالمغنی اپنی تخلیق" ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش" میں یوں رقمطراز ہیں:

" کاروانِ خیال' غبارِ خاطر اور نقشِ آزاد کے مطالعے سے اس نادرۂ روزگار شخصیت کی بہت سی تہیں اور گرہیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ موسیقی، شاعری، فلسفہ و نفسیات انانیت، منطقِ وحدانیت، انکشافات سائنس، داستانِ بے ستون و کوہکن، حکایات بادہ و تریاک، بغداد کی محفلیں، تاج کی رعنائیاں، یاسمین سفید کے عشوے، منطق الطیر کے قصّے، تاریخ کی جھلکیاں، قفس کی روداد، رفیقۂ حیات کا سانحہ ارتحال، ابوالکلام کی ظاہری سنگینی اور

باطنی گداز۔ یہ اور اس طرح کی دوسری ان گنت دلچسپیوں، بصیرتوں، عبرتوں اور حسرتوں کا ہجوم ہے" (ص 92)

مولانا آزاد نے بے شمار مسئلوں کا حل سائنس کے دائرے میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری زندگی ہمارا وجود اور ہماری حقیقت کیا ہے؟ اس کا پتہ لگانے کے لئے انہوں نے سائنسی افکار سے کام لیا ہے۔ ابتدائی زمانے سے لے کر حال کے ترقی یافتہ دور تک بنی نوع انسان کا مطالعہ سائنس کے تناظر میں کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ غبار خاطر میں لکھتے ہیں :

"زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ اور اس کی کوئی ابتداء بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جاکر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے؟ یہ جو ہم سونچ رہے ہیں کہ "انسان کیا ہے" تو خود یہ سونچ اور سمجھ کیا چیز ہے؟ اور پھر حیرت اور درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی، یا نہیں؟

اس وقت سے لے کر جبکہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سرنکال کر سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک، جبکہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سرنکال کر فطرت کے بے شمار چہرے بے نقاب دیکھ رہا ہے، انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں، مگر یہ معمہ ہی رہا" (غبار خاطر۔ ص 109)

اس حقیقت کو جاننے کے لیے بنی نوع انسان نے اب تک جو جو تدابیر اختیار کیں اور اس کے نتیجہ میں وہ کتنا کچھ الجھتا گیا، اس کا تذکرہ وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"ہم اس الجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں، وہ اور زیادہ الجھتا جاتا ہے۔ ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے، اسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں، لیکن جب وہ ہٹتاہے تو معلوم ہوتا ہے، سوپردے اور اس کے پیچھے پڑے تھے اور جو پردہ ہٹا تھا، وہ فی الحقیقت پردے کا ہٹنا نہ تھا، بلکہ نئے نئے پردوں کا نکل آنا تھا۔ ایک سوال کا جواب ابھی مل نہیں چکتاکہ

دس نئے سوال سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ایک راز ابھی حل نہیں ہوچکتا
که سو نئے راز چشمک کرنے لگتے ہیں!" (غبارِ خاطر۔ص 110)

اس مقصد براری میں وہ بیسوی صدی کی genius شخصیت اور نامور سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن کی مرتب کردہ کتاب The evolution of physics (علم طبیعیات کا ارتقاء) کا حوالہ دیتے ہیں اور اس معاملہ میں وہ علم طبیعیات کے عصری نظریہ Quantum Theory تک کا ذکر کرتے ہیں:

" انسٹائن (Einstein) نے اپنی ایک کتاب میں سائنس کی جستجوے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز کی سراغرسانیوں سے تشبیہ دی ہے اور اس میں شک نہیں که نہایت معنی خیز تشبیہہ دی ہے. علم کی یہ سراغرسانی فطرت کی غیر معلوم گہرائیوں کا کھوج لگانا چاہتی تھی ، مگر قدم قدم پر نئے نئے مرحلوں اور نئی نئی دشواریوں سے دو چار ہوتی رہی. ذی مقراطیس (Democritus) کے زمانہ سے لے کر جس نے چار سو برس قبل مسیح مادہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی آج تک، جب که نظریۂ مقادیر عنصری (Quantum Theory) کی رہنمائی میں ہم سالمات کا از سر نو تعاقب کررہے ہیں علم کی ساری کدو کاوش کا نتیجه اس کے سوا کچھ نه نکلا که پچھلی گتھیاں سلجھتی گئیں ، نئی نئی گتھیاں پیدا ہوتی گئیں. اس ڈھائی ہزار برس کی مسافرت میں ہم نے بہت سی نئی منزل کا سراغ پالیا ، جو اثنائے سفر میں نمودار ہوتی رہیں ، لیکن حقیقت کی وہ آخری منزل مقصود جس کے سراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا ، آج بھی اسی طرح غیر معلوم ہے ، جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی. ہم جس قدر اس سے قریب ہونا چاہتے ہیں ، اتنا ہی وہ دور ہوتی جاتی ہے. "

(غبارِ خاطر۔ص 110)

مولانا آزاد عقیدہ سے متعلق کبھی فلسفہ سے رجوع کرتے ہیں تو کبھی سائنس سے۔اس طرح وہ

عقیدہ کا موازنہ دونوں ہی علوم کی روشنی میں کرتے ہیں۔اس کے باوجود بھی وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتے

" سائنس عالمِ محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادّی زندگی کی بے رحم جبریّت (Physical Determinism) کی خبر دیتا ہے اس لیے عقیدہ کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کردے گا ، مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا .... فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کرسکے گا سائنس ثبوت دے گا ، مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے ، اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے ۔ ہم صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کرلے سکتے جنہیں ثابت کرسکتے ہیں اور اس لئے مان لیتے ہیں ۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہییں جنہیں ثابت نہیں کرسکتے ، لیکن مان لینا پڑتا ہے " (غبارِ خاطر۔ص 37)

نظریہ ارتقاء (Theory of Evolution) سے متعلق مولانا آزاد نے غبار خاطر میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔جس میں وہ ماہر حیاتیات ڈاروین کے نظریات کو پیش نظر رکھ کر اپنی بات کہتے ہیں :

" اگر یہاں مادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو پھر مرتبہٗ انسانی میں ابھرنے والی وہ قوت ، جسے ہم فکر و ادراک کے نام سے پکارتے ہیں ، کیا ہے ؟ کس انگیٹھی سے یہ چنگاری اڑی ؟ یہ کیا ہے جو ہم میں یہ جوہر پیدا کردیتی ہے کہ ہم خود مادہ کی حقیقت میں غور و خوض کرنے لگتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے احکام لگاتے ہیں ؟ یہ سچ ہے کہ موجودات کی ہر چیز کی طرح یہ جوہر بھی بتدریج اس درجہ تک پہنچا وہ عرصہ تک نباتات میں سوتا رہا ، حیوانات میں کروٹ بدلنے لگا اور پھر انسانیت کے مرتبہ میں پہنچ کر جاگ اٹھا لیکن صورتِ حال کا یہ علم ہمیں اس گتھی کے سلجھانے

میں کچھ مدد نہیں دیتا ۔ یہ بیج فوراً برگ و بار لے آیا ہو ، یا مدتوں کے نشوو ارتقاکے بعد اس درجہ تک پہنچا ہو ، بہر حال مرتبہ انسانیت کا جوہر و خلاصہ ہے اور اپنی نمود و حقیقت میں تمام مجمع موجودات سے اپنی جگہ الگ اور بالاتر رکھتا ہے ۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حیوانیت کی پچھلی کڑیوں سے جدا ہوگیااور کسی آئندہ کڑی تک مرتفع ہونے کی استعداد اس کے اندر سے سر اٹھانے لگی ۔ وہ زمین کی حکمرانی کے تخت پر بیٹھ کر جب اوپر کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو فضا کے تمام اجرام اسے اس طرح دکھائی دینے لگتے ہیں ، جیسے وہ بھی صرف اسی کی کاربرآریوں کے لیے بنائے گئے ہوں ۔ وہ ان کی بھی پیمایشیں کرتا ہے اور ان کے خواص و افعال پر بھی حکم لگاتا ہے ۔ اسے کارخانۂ قدرت کی لا انتہائیوں کے مقابلہ میں اپنی درماندگیوں کا قدم قدم پر اعتراف کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن درماندگیوں کے اس احساس سے اس کی سعی و طلب کی امنگیں پژمردہ نہیں ہوجاتیں ، بلکہ اور زیادہ شگفتگیوں کے ساتھ ابھرنے لگتی ہیں اور اسے اورزیادہ بلندیوں کی طرف اڑا لے جانا چاہتی ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ فکر و ادراک کی یہ فضائے لامتناہی جو انسان کو اپنی آغوش پرواز میں لیے ہوئے اڑ رہی ہے ، کیا ہے ؟ کیا اس کے جواب میں اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ محض ایک اندھی بہری قوت ہے ، جو اپنے طبعی خواص اور طبعی احوال و ظروف سے ترقی کرتی ہوئی فکر و ادراک کا شعلۂ جوآلہ بن گئی ! جو لوگ مادیت کے دائرے سے باہر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں ، وہ بھی اس کی جرات بہت کم کرسکے کہ اس سوال کا جواب بلا تامل اثبات میں دے دیں ۔ " (غبارِ خاطر۔ص124-125)

نظریۂ ارتقاء پر وہ اپنی بحث جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں :

" میں ابھی اُس انقلاب کی طرف اشارہ کرنا نہیں چاہتا جو

انیسویں صدی کے آخر میں رونما ہونا شروع ہوا 'اور جس نے بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی کلاسیکل طبیعیات کے تمام بنیادی مسلمات یک قلم متزلزل کردیے ۔ میں ابھی اس سے الگ رہ کر ایک عام نقطۂ نگاہ سے مسئلہ کامطالعہ کررہا ہوں ۔

اور پھر خود وہ صورت حال ہم نشوو ارتقا (Evolution) سے تعبیر کرتے ہیں ، کیا ہے ؟ اور کیوں ہے ؟ کیا وہ ایک خاص رُخ کی طرف انگلی اٹھائے اشارہ نہیں کررہی ہے؟ ہم نے سینکڑوں برس کی سراغرسانیوں کے بعد یہ حقیقت معلوم کی کہ تمام موجودات ہستی آج جس شکل و نوعیت میں پائی جاتی ہیں ، یہ بیک دفعہ ظہور میں نہیں آگئیں یعنی کسی براہ راست تخلیقی عمل نے انہیں یکایک یہ شکل و نوعیت نہیں دے دی ، بلکہ ایک تدریجی تغیر کا عالم گیر قانون یہاں کام کرتا رہا ہے اور اس کی اطاعت و انقیاد میں ہر چیز درجہ بدرجہ بدلتی رہتی ہے اور ایک ایسی آہستہ چال سے جسے ہم فلکی اعداد و شمار کی مدتوں سے بھی بہ مشکل اندازہ میں لاسکتے ہیں ، نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے ۔ ذرات سے لے کر اجرام سماوی تک ، سب نے اسی قانون تغیر و تحول کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و نوعیت کا جامہ پہنا ہے ۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی رفتار فطرت ہے جسے ہم 'نشو و ارتقا 'کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ۔ یعنی ایک معین ، طے شدہ ، ہم آہنگ اور منظم ، ارتقائی تقاضہ ہے جو تمام کارخانہ ہستی پر چھایا ہوا ہے اور اسے کسی خاص رُخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لے جارہا ہے ۔ ہر نچلی کڑی بتدریج اپنے سے اوپر کی کڑی کا درجہ پیدا کرے گی ۔ اور ہر اوپر کا درجہ نچلے درجہ کی رفتار حال پر ایک خاص اثر ڈالتے ہوئے اسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا رہے گا ۔ یہ ارتقائی صورت حال خود توضیحی (Self Explanatory) نہیں ہے ، یہ

اپنی ایک توضیح چاہتی ہے لیکن کوئی مادی توضیح ہمیں ملتی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیوں صورت حال ایسی ہی ہوئی کہ یہاں ایک ارتقائی تقاضا موجود ہو اور وہ ہر تخلیقی ظہور کو نچلی حالتوں سے اٹھاتا ہوا بلند تر درجوں کی طرف بڑھائے لے جائے ؟ کیوں فطرت وجود میں رفعت طلبیوں کا ایسا تقاضا پیدا ہوا کہ سلسلۂ اجسام کی ایک مرتب سیڑھی نیچے سے اوپر تک اٹھتی ہوئی چلی گئی ، جس کا ہر درجہ اپنے ماسبق سے اوپر مگر اپنے مابعد سے نیچے پیدا ہوا ہے ؟ کیا یہ صورت حال بغیر کسی معنی اور حقیقت کے ہے ؟ کیا یہ سیڑھی بغیر کسی بالا خانہ کی موجودگی کے بن گئی اور یہاں کوئی بام رفعت نہیں جس تک یہ ہمیں پہنچانا چاہتی ہو ؟" (غبارخاطر۔ص 127-125)

ماہر حیاتیات پروفیسر لائیڈ مارگن نے نظریہ ارتقاء پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی جو سعی کی ہے، اس پر مولانا یوں رقم طراز ہیں :

" زمانۂ حال کے علمائے علم الحیات میں پروفیسر لائیڈ مارگن (Lloyd Morgan) نے اس مسئلہ کا علم الحیاتی (Biological) نقطۂ خیال سے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن بالآخر اسے بھی اسی نتیجہ تک پہنچنا پڑا کہ اس صورت حال کی کوئی مادی توضیح نہیں کی جاسکتی۔ وہ لکھتا ہے کہ جو حاصلات (Resultants) یہاں کام کررہی ہیں ، ہم ان کی توضیح اس اعتبار سے تو کرسکتے ہیں کہ انہیں موجودہ احوال و ظروف کا نتیجہ قرار دیں ، لیکن ارتقائی تقاضا کا فجائی ظہور (Emergence) جس طرح ابھرتا رہا ہے ، مثلاً زندگی کی نمود ، ذہن و ادراک کی جلوہ طرازی ، ذہنی شخصیت اور معنوی انفرادیت کا ڈھلاؤ ، ان کی کوئی توضیح بغیر اس کے نہیں کی جاسکتی کہ ایک الٰہی قوت کی کارفرمائی یہاں تسلیم کرلی جائے۔ ہمیں یہ صورت حال بالآخر

مجبور کردیتی ہے کہ فطرت کائنات میں ایک تخلیقی اصل (Creative Principle) کی کارفرمائی کے اعتقاد سے گریز نہ کریں۔ ایک ایسی تخلیقی اصل جو اس کارخانۂ ظرف و زماں میں ایک لازماں (Timeless) حقیقت ہے۔" (غبار خاطر۔ص 127)

کائنات، وقت، مادہ، پھول پودے اور طیوریات پر مولانا آزاد نے غبار خاطر میں اپنے علم، مشاہدات اور تجربات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جن پر علحدہ علحدہ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

کائنات

علم فلکیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کائنات اربوں کہکشاؤں (Galaxies) پر مشتمل ہے۔ ہر کہکشاں میں سورج کی طرح لاکھوں ستارے موجود ہیں۔ یعنی کسی بھی کہکشاں میں نظام شمسی کی طرح ستاروں کے لاکھوں نظام پائے جاتے ہیں۔ ہر کہکشاں میں ستارے کشش ثقل (Gravitation) کی بدولت اپنی اپنی جگہ پر موجود رہتے ہیں جن کے اطراف مختلف تعداد میں سیارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ علم فلکیات (Astronomy) پر نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) کے اطلاق سے البرٹ آئن اسٹائین اور طبیعیات و فلکیات کے دوسرے ماہرین نے 1920ء میں یہ ثابت کیا کہ کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ ماہر فلکیات Edwin Hubble نے ان نظریات اور اپنے مشاہدات کی روشنی میں یہ شہادت دی کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ کائنات کا ایک حصہ دوسرے حصے سے پرے ہوتا جارہا ہے۔ کائنات کی حرکت اور اس کے پھیلنے سے متعلق مولانا آزاد، غبار خاطر میں کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :

"کائنات ساکن نہیں ہے، متحرک ہے اور ایک خاص رُخ پر بنتی اور سنورتی ہوئی بڑھی چلی جارہی ہے۔ اس کا اندرونی تقاضہ ہر گوشہ میں تعمیر و تکمیل ہے اگر کائنات کی اس عالمگیر ارتقائی رفتار کی کوئی مادّی توضیح ہمیں نہیں ملتی، تو ہم غلطی پر نہیں ہوسکتے۔"

(غبار خاطر۔ص128)

وقت

زمانہ جانتا ہے کہ وقت نے جس کسی کا ساتھ دیا وہ کامیابی اور کامرانی کی سیڑھیاں چڑھتا گیا اور سرفراز ہوگیا۔ لیکن جب کسی پر براوقت آتا ہے تو وہ ناکامیوں کے اندھیروں میں گم ہو جاتا ہے اور اپنی حیثیت و وقعت کھو دیتا ہے۔ اس کے باوجود وقت ہمارے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ چنانچہ وقت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ نہ کوئی لغت اس کے لفظی معنی بتلا سکتی ہے اور نہ کوئی ماہر طبیعیات اس کی تعریف کر سکتا ہے۔ کیوں کہ سائنس کی زبان میں وقت کوئی مطلق اکائی نہیں ہے۔ یہ ایک طبیعی مقدار ہے جو بار بار دہرائے جانے والے کوئی دو، دَوری (Periodic) واقعات کے درمیان کے انتظار کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی لیے وقت کو دَور (Period) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ گھڑی کا پنڈلم جب دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں تک کے فاصلے کی تکمیل کرتا ہے تو گزرا ہوا وقت، ایک سکنڈ کہلاتا ہے۔ اسی طرح سورج کے مسلسل دوبار طلوع ہونے کا درمیانی وقت ایک دن کہلاتا ہے۔ یہ وقت ہی ہے جس کی بنا پر زمانہ ماضی، حال اور مستقبل میں منقسم ہوتا ہے۔ دو گزرے ہوئے واقعات کا درمیانی وقت ''ماضی'' ہے۔ ماضی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس کا وقفہ چند لمحوں یا گھنٹوں یا سالوں پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ آئندہ دو واقعات کا درمیانی وقت ''مستقبل'' ہوتا ہے۔ ماضی کی طرح مستقبل کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ لیکن ''حال'' اتنا محدود ہوتا ہے کہ وقت کے اس دھارے کو روکا نہیں جاسکتا۔ اس لئے علم طبیعیات میں ''حال'' کچھ نہیں ہوتا۔ وقت جو کچھ ہوتا ہے وہ یا تو ماضی ہوتا ہے یا پھر مستقبل۔ البتہ کیمرے کی آنکھ، حال پر مشتمل کسی لمحہ کے منظر کو قید کر سکتی ہے۔ جس لمحہ کیمرے کا بٹن دبا، اسی لمحہ کا منظر اس میں قید ہوگیا۔ اس طرح کھینچی گئی تصویر حال کے کسی مخصوص لمحہ کے عکس کو ظاہر کرتی ہے۔ علم نجوم بھی ماضی یا مستقبل ہی کی بات کرتا ہے۔ اسی لئے علم نجوم کے ماہر، انسان پر گزرے ہوئے ماضی کا حال بتلا سکتے ہیں یا پھر مستقبل کا۔ کوئی نجومی یہ نہیں بتلا سکتا کہ کسی شخص پر اب کیا گزر رہی ہے۔ غبار خاطر میں ماضی، حال اور مستقبل پر مولانا آزاد نے بھی بحث کی ہے:

''عرب کے فلسفی ابوالعلاء معریٰ نے زمانہ کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا : کل جو گزر چکا، آج جو گزر رہا ہے،

کل جو آنے والا ہے۔

لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم "حال" کہتے ہیں وہ فی الحقیقت ہے کہاں ؟ یہاں وقت کا جو احساس بھی ہمیں میسر ہے ، وہ یا تو "ماضی" کی نوعیت رکھتا ہے' یا "مستقبل" کی ، اور انہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے ، جسے ہم "حال" کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ "ماضی" اور "مستقبل" کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکتے۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا اور اُدھر اُس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جاچکا ، یا "مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں ، لیکن خود "حال" کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دیتا۔ جس وقت کا ہم نے پیچھاکرنا چاہا تھا ، وہ "حال" تھا اور ہماری پکڑ میں آیا ہے، وہ "ماضی" ہے:

نکل چکا ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے "

(غبارِ خاطر۔ص 248)

مادّہ

زمانۂ قدیم ہی سے بنی نوع انسان کو اس بات کا علم تھا کہ تمام اشیا مادے سے بنتی ہیں جو ٹھوس، مائع اور گیس کی حالتوں میں پایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں سائنسدانوں نے اس کی مزید چار حالتوں کا پتہ لگایا۔ یہ حالتیں Super Fluids ، Super Conductors ، Plasmas اور Bose-Einstein Condensates کہلاتی ہیں۔ پلازماز ،الکٹران اور گیسوں کے مثبت رواں (Positive Ions) کے آمیزے ہوتے ہیں اور سوپر کنڈکٹرس ایسے ٹھوس ہوتے ہیں جن میں سے

الکٹران بہت ہی آسانی کے ساتھ گزر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ایک بار ان میں سے برقی رو بہنے لگتی ہے تو الکٹرک پاور سپلائی کے بند کر دینے کے باوجود بھی وہ بہتی ہی رہتی ہے۔ سوپر فلویڈز، بغیر کسی مزاحمت کے بہنے والے سیال مادے ہوتے ہیں۔ جس برتن میں انہیں رکھا جاتا ہے اس کے باریک سے باریک مسامات میں سے وہ آسانی کے ساتھ گزر سکتے ہیں۔ جب کہ Bose-Einstein Condensates گیس کے لاکھوں جوہروں پر مشتمل ہوتے ہیں جو بہت زیادہ سردی کی صورت میں ایک گچھے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

سائنسدانوں نے مادے کی حالتوں کے علاوہ اس کی دو غیر معمولی شکلیں، ضد مادہ (anti matter) اور تاریک مادہ (Dark matter) دریافت کیا ہے۔ توانائی کو جب مادے میں تبدیل کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ضد مادہ حاصل ہوتا ہے۔ برطانوی ماہر طبعیات Paul A.M. Dirac نے سب سے پہلے 1930ء میں دنیائے سائنس کو ضد مادے سے متعارف کروایا تھا۔ ضد مادہ کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ جب وہ اصل مادہ سے ملتا ہے تو دونوں مادے تباہ ہو جاتے ہیں۔ کائنات میں 90 فیصد سے زیادہ ایسا مادہ پایا جاتا ہے جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ نظر نہ آنے والا یہ مادہ، تاریک مادہ کہلاتا ہے۔ مادے سے متعلق سائنسدانوں کا یہ ماننا ہے کہ مادے کے ننھے ننھے ذرات جسامت نہیں رکھتے بلکہ وہ قوتوں کے مرکز (Centre of forces) کی طرح عمل کرتے ہیں اور قوت کے میدانوں (Fields of force) کے ذریعہ ایک دوسرے کو کشش کرتے ہیں یا پھر دفع (Repel) کرتے ہیں۔ اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ٹھوس مادہ حقیقت میں توانائی کے میدان (Field energy) کے چھوٹے چھوٹے بنڈلس سے بنا ہوا ہوتا ہے۔

یہ بات تو ہم سب پر عیاں ہے کہ مادے کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ جو مادے کی خصوصیت کو برقرار رکھتا ہے وہ سالمہ (Molecule) کہلاتا ہے۔ اسی طرح کسی عنصر کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جس میں عنصر کی مکمل خصوصیت پائی جاتی ہے، جوہر کہلاتا ہے۔ عام طور پر ہر سالمہ چند ایک جوہروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مختلف عناصر کے جوہروں کی کمیت مختلف ہوتی ہے اور اسی طرح مختلف مادوں کے سالمات میں جوہروں کی تعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کسی جوہر میں تین بنیادی ذرات الکٹران، پروٹان اور نیوٹران پائے جاتے ہیں۔ ان میں الکٹران سب سے ہلکے ذرّے ہوتے ہیں۔ جن پر منفی برقی بار

(Negative Electric Charge) پایا جاتا ہے۔ یہ ذرّے جب کسی دھاتی تار میں دوڑنے لگتے ہیں تو برقی رو بہنے لگتی ہے۔ کیمیائی تعاملات میں یہی الکٹران اہم رول انجام دیتے ہیں۔ تمام الکٹرانک آلات ان ہی کے ذریعہ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد نے مادّے کی بدلتی ہوئی نوعیت کا جائزہ کچھ اس طرح لیا ہے :

" اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مادّہ کی نوعیت کے بارے میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی نے جو عقائد پیدا کئے تھے ، وہ اس صدی کے شروع ہوتے ہی ہلنا شروع ہوگئے اور اب یکسر منہدم ہوچکے ہیں۔ اب ٹھوس مادّہ کی جگہ مجرّد قوت نے لے لی ہے ، اور الکٹران (Electron) کے خواص و افعال اور سالمات کے اعدادی و شماری انضباط کے مباحث نے معاملہ کو سائنس کے دائرہ سے نکال کر پھر فلسفہ کے صحرا میں گم کردیا ہے۔ سائنس کو اپنی خارجیت (Objective) کے علم و انضباط کا جو یقین تھا ، وہ اب یکسر متزلزل ہوچکا اور علم پھر داخلی ذہنیت (Subjective) کے اُس ذہنی اور کلیاتی مقام پر واپس لوٹ رہا ہے ، جہاں سے نشاتِ جدیدہ کے دور کے بعد اس نے نئی مسافرت کے قدم اٹھائے تھے "

(غبارِ خاطر۔ ص 129-128)

پھول ، پودے

پودوں کی نشوونما، ساخت، درجہ بندی ، ان کے پھلنے پھولنے اور فوائد و استعمال کا مطالعہ علم نباتیات (Botany) کہلاتا ہے۔ پیڑ پودوں کی انوکھی دنیا کے بارے میں ماہر نباتیات ہی مکمل طور پر جان سکتے ہیں۔ باغبانی سے دلچسپی رکھنے والے لوگ، پودوں سے متعلق جزوی معلومات رکھتے ہیں۔ کئی ایک اقسام کے پھول، پودوں سے متعلق جانکاری رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ باغوں میں لگائے جانے والے موسمی پودوں میں Aster ، Petunia ، Phlox' Calliopsis ، Pinks ، Poppy ، Pansy ، Cosmos ، Corn Flower ، Sweet Peas ، Salvia اور

Gloriosa شامل ہیں۔ یہ وہ پودے ہیں جن پر قسم قسم کے خوشنما گل بوٹے کھلتے ہیں۔ پھولوں اور پودوں سے متعلق مولانا آزاد کا مشاہدہ نہ صرف وسیع تھا بلکہ وہ ان کے بارے میں تفصیلی جانکاری رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

" گُل خطمی کے پھولوں کی تشبیہہ کتنی ہی دلکش ہو ، مگر یہ ماننا پڑے گا کہ حُسن نزاکت کی ادائیں یہاں نہیں مل سکتیں گلاس خوشنما ہیں ، مگر نازک نہیں ہیں۔ پٹونیا (Petunia) نے بھی میدان کے ہر گوشے کو دامن رنگین بنا دیا تھا۔ لیکن اس کی رنگتوں کی سادگی سے تخیل کی پیاس کہاں بجھ سکتی تھی ! میدان کے وسط میں جھنڈے کے چبوترے کے دونوں طرف اسٹر (Aster) ، کارن فلاور (Cornflawer) ، سویٹ پیس (Sweet Peas) ' کوکنار (Poppy) ، فلکس (Phlox) ، کلیو پسیس (Calliopsis) اور کاسمس (Cosmos) کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نکل آئے تھے۔ گویا میدان کی کمر میں بو قلموں رنگوں کا ایک پٹکہ بندہ گیا تھا۔ لیکن وہ بھی چشم تماشائی کا سامان د یدیا تھا ، اہل بینش کے لیے نوق نظر کا سامان نہ تھا ، حال آنکہ !

بزم میں اہل نظر بھی تھے ، تماشائی بھی

اس غرض کے لیے پینکس (Pinks) ، سلویا (Salvia) اوٗر پینزی (Pansy) وغیرہ کے تختوں کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ جن کی جلوہ فروشیاں ہر دم دیدہ و دل کو دعوت نظارہ دیتی رہتی تھیں۔ "

(غبار خاطر۔ص 199)

فطرت میں پائے جانے والے کئی جاندار ایسے ہوتے ہیں جن کا رنگ بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ان کے ماحول کا۔ جس کے نتیجہ میں وہ جاندار اپنے دشمن کو دھوکہ دیتے ہوئے اپنی جان بچا پاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تتلیوں کا رنگ بھی پھول، پتوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ سائنس کی اصطلاح میں ماحول اور جاندار کے رنگوں میں یکسانیت کا پایا جانا Camouflage کہلاتا ہے۔ بری فوج میدان جنگ میں اسی اصول پر

عمل پیرا ہوتی ہے جس کے لباس اور ہیئت کا رنگ ، پہاڑ ، پیڑ اور پودوں کا ملا جلا رنگ ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے تتلیوں اور پھولوں کے Camouflage ، پھولوں کی نزاکت اور ان کے حسن کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا ہے :

" قدرت کے قلم صنعت کی یہ بھی ایک عجیب کرشمہ سنجی ہے کہ پھولوں کے ورق اور تتلیوں کے پروں پر ایک ہی موقلم سے مینا کاری کردی اور ایک ہی رنگ کی دواتیں کام میں لائی گئیں۔ ان پھولوں کے اوراق کا مطالعہ کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بڑے پھولوں کی کترن سے کچھ کاغذ بچ رہا تھا ، اسے بھی ضائع نہیں کیا گیا ، اور قینچی سے تراش کر ننھے ننھے پھولوں کے ورق بنالیے۔ اگر ایک چیز نازک اور خوبصورت ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں ، یہ پھول ہے۔ لیکن اگر خود پھولوں کے لیے کچھ کہنا چاہیں تو انہیں کس چیز سے تشبیہ دیں ! حقیقت یہ ہے کہ زبان درماندہ کو یہاں یارائے سخن نہیں ، اور خاموشی کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ حُسن کی جلوہ طرازیاں محویت کا پیام ہوتی ہیں ، خامہ فرسائی اور سخن آرائی کا تقاضا نہیں ہوتا "

(غبارِ خاطر۔ص 200-199)

موسمی پودوں کا عالم وجود میں آنا ، ان پر پھولوں کا کھلنا اور پھر موسم کے ختم ہوتے ہی ان پودوں کا خاتمہ ہو جانا ، ان سب مدارج کو انھوں نے کتنے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے:

" ان پھولوں کو موسمی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے۔ ادھر موسم ختم ہوا ، اُدھر انہوں نے بھی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ، گویا زندگی کا ایک ہی پیراہن اُن کے حصے میں آیا تھا ، وہی کفن کا بھی کام دے گیا۔

بہار میں پھولوں سے درخت لدجاتے ہیں ، خزاں میں غائب ہوجاتے ہیں۔ پھر جونہی موسم کا دور پلٹتا ہے ، دوبارہ

آموجودہوتے ہیں۔ مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوہ یک رنگی یا ساختگی دیکھیے کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھا دی، تو پھر دوبارہ مڑکے دیکھنا نہیں چاہتے۔ "

(غبارخاطر۔ص200-201)

مولانا آزاد نے پھولوں کی مختلف وضع قطع کو مختلف انداز میں انسانی نشست و برخواست سے تشبیہہ دی ہے۔ خاص کر موسمی پودے Gloriosa Superba کے پھول کھلنے اور پھر مرجھانے کی منزلوں کو کتنے تفصیل کے ساتھ کیسے دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

" پھولوں کی جمالیاتی (Aesthetics) منظر سے اگر نظر ہٹائیے تو پھرایک اور گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ ان کی عجائب آفرینیوں کا گوشہ ہے۔ روح نباتی بھی روح حیوانی کی طرح قسم قسم کے جسموں میں ابھرتی ہے اور طرح طرح کے افعال و خواص کی نمائش کرتی رہتی ہے۔ یہ کہیں سوئی ہوئی دکھائی دیتی ہے کہیں کروٹ بدلنے لگتی ہے اور پھر کہیں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہمارے اس چھوٹے سے گوشۂ چمن میں ابھی صرف ایک ہی پھول ایسا ہے جسے اس قسم کے غیر معمولی پھولوں میں سے شمار کیا جاسکتا ہے یعنی گلوری اوس سیوپربا (Gloriosa Superba) اس کی پانچ جڑیں گملوں میں لگائی گئی تھیں، چار بار آور ہوئیں اب ان کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں۔ ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلے گا، پھر پیالہ کی طرح الٹ جائے گا، پھر فانوس کی طرح مدوّر ہونے لگے گا، پھر تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رک جائے گا اور پھر دیکھیے، تو جن منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا، انہی منزلوں سے گزرتا ہوا الٹے پاؤں واپس ہونے لگے گا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائیں گی، پھر اچانک یہ پیالہ الٹ جائے گا، گویا زندگی کے جام واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا۔

لیے بیٹھا ہے ایک دو چار جام واژگوں وہ بھی

ہر پھول کی آمد و رفت کی یہ مسافرت دس سے بارہ دن کے اندر طے ہوا کرتی ہے ، چھ دن آنے میں لگتے ہیں ، چھ واپسی میں ، اور دراصل اس کا آنا بھی جانے ہی کے لیے ہوتا ہے :

ترا آنا نہ تھا ظالم ! مگر تمہید جانے کی

رنگت کے اعتبار سے بھی اس کی بو قلمونیو ںکا کچھ عجیب حال ہے ۔ کلیاں جب نمودار ہوں گی تو ہلکے سبز رنگ کی ہوں گی ۔ پھر جوں جوں کھلنے کا وقت آنے لگے گا ، زردی ابھرنے لگے گی ۔ اور پھر زردی بتدریج سرخی مائل ہونا شروع ہو جائے گی ۔ پہلے آدھا سُرخ آدھا زرد رہے گا پھر زردی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگے گی اور پورا پھول سرخ ہوکر مرچ کی پھلیوں کی طرح چمکنے لگے گا ۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی نسل ہندوستان کی طرف منسوب کی جاتی ہے ، مگر یہاں اس کی شہرت نہیں ۔ "

(غبارِ خاطر۔ ص 201-202)

پھول، پودوں کا تولیدی Organ ہوتا ہے ۔ پودوں کی نسل کے بڑھنے میں ان کی زیرگی (Pollination) بہت اہمیت رکھتی ہے جس کے لئے خاص میکانزم کی ضرورت ہوتی ہے ۔ پودوں میں زیرگی کیوں ضروری ہے؟ اور کون کون سے اجزاء اس کے لئے ذمہ دار ہوتے ہیں؟ ان پر وہ کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :

" یہ پھول نباتات کی اُس قسم میں داخل ہے ، جسے اتحاد تناسلی کے لیے خارج کی مداخلت مطلوب ہوتی ہے اور کبھی ہوا کے جھونکوں اور کبھی تتلیوں اور مکھیوں کی نشست و برخاست سے فطرت یہ کام لے لیا کرتی ہے ، اس پھول کا جز رجولیت اس کے انوثیت کے جز سے اس طرح بے تعلق واقع ہوا ہے کہ جب تک خارج کا ہاتھ مادۂ تلقیح کو ایک جگہ سے اٹھاکر دوسری جگہ نہ پہنچا دے ،

تلقیح کا عمل انجام نہیں پاسکتا ۔ جن پھولوں کو یہ خارجی اعانت مل جاتی ہے وہ باردار ہوجاتے ہیں اور اپنا بیج چھوڑجاتے ہیں ، جنہیں نہیں ملتی ، بانجھ ہوکر بغیر بیج بنائے ختم ہوجاتے ہیں ۔ ان پودوں کے لیے تتلیوں کا ایک گروہ بروقت پہنچ گیا تھا ۔ چنانچہ اکثر پھول باردار ہوگئے ۔ " (غبارخاطر۔ص 202)

طیوریات

علم حیوانیات کی وہ شاخ جس میں پرندوں کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے طیوریات (Ornithology) کہلاتی ہے۔ طیوریات میں پرندوں کی جسمانی ساخت، تاریخ، درجہ بندی، عادات و اطوار، حرکات وسکنات کا مطالعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں پرندوں کی مجامعت (Mating)، ان کا گھونسلا بنانا، انڈوں کو سینا، بچوں کی پرورش کرنا اور انہیں اڑنا سکھانا جیسے امور کا بغور مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ پرندوں کی اڑان، ہجرت (Migration) اور بحری سفر کے مطالعہ کے علاوہ ان کی معاشی و ماحولیاتی اہمیت، خاص کر زراعت میں ان کی قدرو قیمت کا پتہ لگایا جاتا ہے جس میں وہ بحیثیت شکاری ان کیڑے مکوڑوں کا صفایا کرتے ہیں جو فصلوں کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ مولانا آزاد اگرچہ ماہر طیوریات نہیں تھے اس کے باوجود انہوں نے غبار خاطر میں پرندوں کے بارے میں نہ صرف کھل کر اظہار خیال کیا ہے بلکہ ان کی بہت سی خصوصیات کا عملی طور پر مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے :

" ہر ملک کی فضا طبیعتوں میں ایک خاص طرح کا طبعی ذوق پیدا کردیا کرتی ہے ۔ ہندوستان کا عام طبعی ذوق بلبل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہوسکتا تھا ، کیونکہ ملک کی فضا دوسری طرح کی صداؤں سے بھری ہوئی تھی ۔ یہاں کے پرندوں کی شہرت طوطا اور مینا کے پروں سے اڑی اور دنیا کے عجائب میں سے شمار کی گئی ۔

بلبل کی جگہ یہاں کوئل کی صدائیں شاعری کے کام آئیں ،

اور اس میں شک نہیں کہ اس کی کوک درد آشناء لوگوں کو غم و الم کی چیخوں سے کم محسوس نہیں ہوتی۔

بلبل کی نواؤں کا نوق تو ایران کے حصے میں آیا ہے۔ موسم بہار میں باغ و صحرا ہی نہیں بلکہ ہر گھر کا پائین باغ انکی نواؤں سے گونج اٹھتا ہے۔ بچے جھولے میں اُنکی لوریاں سنتے سنتے سوجائیں گے اور مائیں اشارہ کرکے بتلائیں گی کہ دیکھ یہ بلبل ہے، جو تجھے اپنی کہانی سنا رہی ہے۔ جنوب سے شمال کی طرف جس قدر بڑھتے جائیں، یہ افسون فطرت بھی زیادہ عام اور گہرا ہوتا جاتا ہے...... " (غبار خاطر۔ص 205-204)

پرندے مواصلات کے لیے انسانوں کی مختلف بولیوں کی طرح مختلف آوازیں نکالتے ہیں۔ جیسے چڑیوں کا چہچہانا، کوئل کا کوکنا اور کبوتروں کا غٹرغوں کرنا وغیرہ۔ کہیں کہیں پرندوں کی قافیہ سنجی کے بارے میں بھی سنا جاتا رہا ہے۔ مولانا آزاد اس امر کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" یہ جو کہا کہ مُرغانِ باغ قافیہ سنجی کرتے ہیں، تو یہ مبالغہ نہیں ہے، واقعہ ہے۔ میں نے ایران کے چمن زاروں میں ہزارکو قافیہ سنجی کرتے ہوئے خود سنا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کے لَے بدلتی جائے گی اور ہر لَے ایک ہی طرح کے اتار پر ختم ہوگی، جو سننے میں ٹھیک ٹھیک شعروں کے قوافی کی طرح متوازن اور متجانس محسوس ہونگے۔ گھنٹوں سنتے رہیے، ان قافیوں کا تسلسل ٹوٹنے والا نہیں، آواز جب ٹوٹے گی، ایک ہی قافیہ پر ٹوٹے گی۔ "

(غبار خاطر۔ص 205)

یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ ہمارے ملک میں طوطا، مینا اور کوئل اپنی نوائی کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ جہاں تک بلبلوں کا تعلق ہے وہ ہمارے ملک میں کتنے قسم کی اور کہاں پائی جاتی ہیں اور قلعہ احمد نگر میں بلبلوں کے دکھائی دیئے جانے کی تفصیلات وہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں :

" ہندوستان کے پہاڑوں میں پہاڑی بلبل کا ترنّم، نینی تال

اور کانگڑہ میں زیادہ سنا جاسکتا ہے ، مسوری اور شملہ کی چٹانی فضا اس کے لیے کافی کشش پیدا نہیں کرسکتی تھی۔ ہندوستان میں عام طور پر چار قسم کی بلبلیں پائی جاتی ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ خوشنوا قسم وہ ہے جس کے چہرے کے دونوں طرف سفید بوٹے ہوتے ہیں اور اس لیے آج کل نیچرل ہسٹری کی تقسیم میں اسے وہائٹ چیکڈ(White Cheeked) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ شاما کو اگرچہ عام طور پر بلبل نہیں سمجھا جاتا لیکن اسے بھی میدانی سرزمینوں کا بلبل ہی تصور کرنا چاہیے ، مغربی یو ، پی اور پنجاب میں اس کی متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں ۔

اس وقت تک بلبل کے تین جوڑے یہاں دکھائی دئیے ہیں ۔ تینوں معمولی پہاڑی قسم کے ہیں ، جنہیں انگریزی میں (White Whiskered) کے نام سے پکارتے ہیں ۔ ایک نے تو پھول کی ایک بیل میں آشیانہ بھی بنالیا ہے ۔ دوپہر کو پہلے بالکل خاموشی رہے گی ، پھر جونہی میں کچھ دیر لیٹنے کے بعد اٹھونگا اور لکھنے کے لیے بیٹھو نگا ، معاً ان کی نوائیں شروع ہوجائیں گی ، گویا انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ یہی وقت ہے جب ایک ہم صفیر اپنے دل و جگر کے زخموں کی پٹیا ں کھولتا ہے ، اس لیے نالہ و فریاد کے پیہم چرکے لگانا شروع کردیں ۔...... " (غبار خاطر۔ص 207)

قلعہ احمد نگر میں مولانا آزاد اور ان کے رفقا کو جن کمروں میں رکھا گیا تھا وہاں پر چڑیوں کے غول بسیرا کیا کرتے تھے۔ ان کی دن بھر کی حرکات و سکنات اور رین بسیرا کے لیے سازگار ماحول کا پایا جانا موصوف کے خط" چڑیا چڑے کی کہانی" میں صاف طور پر عیاں ہوجاتا ہے :

" یہاں کمرے جو ہمیں رہنے کو ملے ہیں پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں ۔ چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور

شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جابجا گھونسلا بنانے کے قدرتی گوشے نکل آئے اور گوریاؤں کی بستیاں آباد ہوگئیں ۔ دن بھر ان کا ہنگامہ' تگ و دو گرم رہتا ہے۔ کلکتہ میں بالی گنج کا علاقہ چونکہ کھلا اور درختوں سے بھرا ہے ۔ اس لیے وہاں بھی مکانوں کے برآمدوں اور کارنسوں پر چڑیوں کے غول ہمیشہ حملہ کرتے رہتے ہیں ، یہاں کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آگئی :

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ !

ہم بیاباں میں ہیں ، اور گھر میں بہار آئی ہے

(غبار خاطر۔ص209)

پرندوں کا گھونسلا بنانا ایک ایسا عمل ہے جس کا مشاہدہ ماہر طیوریات بڑی تفصیل سے کیا کرتے ہیں ۔ کیوں کہ مختلف قسم کے پرندے مختلف مقامات پر گھونسلا بناتے ہیں ۔ اور پھر ان گھونسلوں کی وضع قطع بھی مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح مختلف ممالک کے باشندے اپنا گھر بناتے وقت ان کے تحفظ اور جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح پرندے بھی اپنا گھونسلا بناتے وقت انڈوں کے تحفظ کا اور بچوں کو شدید موسم کے مضر اثرات سے بچاؤ کا خیال رکھتے ہیں ۔ چنانچہ گھریلو چڑیوں کو گھونسلا بنانے میں کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں، ان کا مولانا آزاد نے تفصیلی مشاہدہ کیا تھا اور اس کی منظر کشی وہ کچھ اس پیرائے میں کرتے ہیں کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارا عمل ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے:

"گذشتہ سال جب اگست میں یہاں ہم آئے تھے تو ان چڑیوں کی آشیان سازیوں نے بہت پریشان کردیا تھا ۔ کمرہ کے مشرقی گوشہ میں منہ دھونے کی ٹیبل لگی ہے ۔ ٹھیک اس کے اوپر نہیں معلوم کب سے ایک پُرانا گھونسلا تعمیر پاچکا تھا ۔ دن بھر میدان سے تنکے چن چن کر لاتیں اور گھونسلے میں بچھانا چاہتیں ۔ وہ ٹیبل پر گرکے اسے کوڑے کرکٹ سے اٹ دیتے ۔ ادھر پانی کا جگ بھرواکے رکھا ، اُدھر تنکوں کی بارش شروع ہوگئی ۔ پچھم کی طرف

چار پائی دیوار سے لگی تھی ، اس کے اوپر نئی تعمیروں کی سرگرمیاں جاری تھیں ۔ ان نئی تعمیروں کا ہنگامہ اور زیادہ عاجز کردینے والا تھا ۔ ان چڑیوں کو ذرا سی تو چونچ ملی ہے اور مٹھی بھر کا بھی بدن نہیں ، لیکن طلب و سعی کا جوش اس بَلا کا پایا ہے کہ چند منٹوں کے اندر بالشت بھر کلفات کھود کے صاف کردیں گی ۔ حکیم ارشمیدس (Archimedes) کا مقولہ مشہور ہے (Dos moi pau sto kai ten gen kineso) مجھے فضا میں کھڑے ہونے کی جگہ دے دو ، میں کرۂ ارضی کو اس کی جگہ سے ہٹا دونگا ۔ اس دعوی کی تصدیق ان چڑیوں کی سرگرمیاں دیکھ کر ہوجاتی ہے ۔ پہلے دیوار پر چونچ مار مار کے اتنی جگہ بنالیں گی کہ پنجے ٹیکنے کا سہارا نکل آئے ۔ پھر اس پر پنجے جماکر چونچ کا پھاوڑا چلانا شروع کردیں گی اور اس زور سے چلائیں گی کہ سارا جسم سکڑ سکڑ کر کانپنے لگے گا ، اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے ، تو کئی انچ کلفات اڑچکی ہوگی ۔ مکان چونکہ پرانا ہے اس لیے نہیں معلوم کتنی مرتبہ چونے اور ریت کی تہیں دیوار پر چڑھتی رہی ہیں ۔ اب مل ملاکر تعمیری مسالہ کا ایک موٹا سا دَل بن گیا ہے ۔ ٹوٹتا ہے تو سارے کمرے میں گرد کا دھواں پھیل جاتا ہے ، اور کپڑوں کو دیکھیے تو غبار کی تہیں جم گئی ہیں ۔ "

(غبارِ خاطر۔ ص 210)

چڑیوں کے شور وغل اور گھونسلا بنانے کے دوران کمرے میں بکھرے تنکے، گھاس پھونس، گرد وغیرہ سے بیزار ہوکر انہیں کہیں اور بھگانے کے لئے مولانا آزاد کئی طرح سے کوشش کرتے ہیں مگر انہیں اس میں کامیابی نہیں ملتی ۔ چنانچہ وہ تھک ہار کر" جیو اور جینے دو" کے مصداق چڑیوں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں ۔ جس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں :

" ایک دن خیال ہوا کہ جب صلح ہوگئی ، تو چاہیے کہ

پوری طرح صلح ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کہ رہیں ایک ہی گھر میں اور رہیں بیگانوں کی طرح۔ میں نے باروچی خانے سے تھوڑا سا کچا چاول منگوایا اور جس صوفے پر بیٹھا کرتا ہوں ، اس کے سامنے کی دری پر چند دانے چھٹک دیے۔ پھر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا ، جیسے ایک شکاری دام بچھا کے بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر تک تو مہمانوں کو توجہ نہیں ہوئی ، اگر ہوئی بھی تو ایک غلط انداز نظر سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ لیکن پھر صاف نظر آگیا کہ معشوقان ستم پیشہ کے تغافل کی طرح یہ تغافل بھی نظر بازی کا ایک پردہ ہے ، ورنہ نیلے رنگ کی دری پر سفید سفید ابھرے ہوئے دانوں کی کشش ایسی نہیں کہ کام نہ کرجائے۔

پہلے ایک چڑیا آئی اور اِدھر اُدھر کُودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑتی ، کبھی دانہ ڈالنے والے پر ، کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہورہا ہے اور کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ گوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہوجاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھاکے سامنے کی طرف دیکھے گی۔ پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اٹھائے گی ، اور چہرے پر تفحص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا ، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا اور ہو کیا رہا ہے ؟ ایسی ہی متفحص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر ابھر رہی تھیں۔

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے ۔ لیکن براہ راست ، دانوں کی طرف نہیں آڑے ترچھے ہوکر بڑھتے اور کتراکر نکل جاتے ۔ گویا یہ بات دکھائی جارہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں ۔...... " (غبارِ خاطر۔ص 216-214)

ماہر طیوریات جب مخصوص پرندوں کی عادات واطوار کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں مقام مشاہدہ پر بغیر کسی حرکت کے ایسا بیٹھنا پڑتا ہے جیسے کہ وہ بے جان شئے ہوں ۔ ان کی ذرا سی بھی حرکت پرندوں کو ان کے وجود کا احساس دلا دیتی ہے جس پر وہ اپنے عوامل کی آزادانہ اور فطری طور پر انجام دہی نہیں کر پاتے ۔ کچھ ایسا ہی خیال ان شکاریوں کو بھی رکھنا پڑتا ہے جو پرندوں کو پکڑنے کے لئے اپنا جال بچھا رکھتے ہیں :

" آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیاد کو اپنی نگرانیاں کرنی پڑتی ہیں ، جونہی اُن کے قدموں کا رُخ دانوں کی طرف پھرا ، میں نے دم سادہ لیا ، نگاہیں دوسری طرف کرلیں ، اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنالیا ، گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے ، کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نگاہ شوق نے مضطرب ہوکر ذرا بھی جلد بازی کی ، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے گا ۔ یہ گویا ناز حسن اور نیاز عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا ۔

خیر ، خدا خدا کرکے اس عشوۂ تغافل نما کے ابتدائی مرحلے طے ہوئے اور ایک بت طنّاز نے صاف صاف دانوں کی طرف رُخ کیا مگر یہ رُخ بھی کیا قیامت کا رُخ تھا ۔ ہزار تغافل اس کے جلو میں چل رہے تھے ۔............

ایک قدم آگے بڑھتا تھا تو دو قدم پیچھے ہٹتے تھے ۔ میں جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ التفات و تغافل کا یہ ملا جلا انداز بھی کیا خوب انداز ہے ۔ کاش تھوڑی سی تبدیلی اس میں کی جاسکتی ، دو قدم آگے بڑھتے ، ایک قدم پیچھے ہٹتا ،غالبؔ کیا خوب کہہ گیا ہے :

وداع وصل جداگانه لذتے دارد

ہزار بار برو ، صد ہزار بار بیا

التفات و تغافل کی ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ فروشی ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنو مند چڑے نے جو اپنی قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جراتوں کے لحاظ سے پورے حلقہ میں ممتاز تھا ، سلسلہ ٔ کارکی درازی سے اکتا کر بے باکانہ قدم اٹھادیا ۔اس ایک قدم کا اٹھنا تھا کہ معلوم ہوا جیسے اچانک تمام رکے ہوئے قدموں کے بندھن کھل پڑے ۔ اب نہ کسی قدم میں جھجک تھی ، نہ کسی نگاہ میں تذبذب ، مجمع کا مجمع بہ یک دفعہ دانوں پر ٹوٹ پڑا اور اگر انگریزی محاورہ کی تعبیر مستعار لی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ حجاب و تامل کی ساری برف اچانک ٹوٹ گئی ، یا یوں کہیے کہ پگھل گئی ۔غور کیجیے تو اس کارگاہ عمل کے ہر گوشہ کی قدم رانیاں ہمیشہ اسی ایک قدم کے انتظار میں رہا کرتی ہیں ۔جب تک یہ نہیں اٹھتا ، سارے قدم زمین میں گڑے رہتے ہیں ، یہ اُٹھا اور گویا ساری دنیا اچانک اُٹھ گئی ۔اس بزم سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا ۔ وہ ہمیشہ انہیں کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھالینے کی جرات رکھتے تھے ۔ شاد عظیم آبادی مرحوم نے ایک شعر کیا خوب کہا تھا :

یہ بزم مے ہے ، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں ، مینا اسی کا ہے

اس چڑے کا یہ بے باکانہ اقدام کچھ ایسا دل پسند واقع ہوا ، کہ اسی وقت دل نے ٹھان لی ، اس مرد کار سے رسم و راہ بڑھانی چاہیے ۔ میں نے اس کا نام قلندرؔ رکھ دیا۔ کیونکہ بے دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کا بانکپن بھی

ملا ہوا تھا ، اور اس کی وضع قلندرانہ کو آب و تاب دے رہا تھا :

رہے ایک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے

بڑھا دو چین ابرو پر ادائے کجکلاہی کو

دو تین دن تک اسی طرح ان کی خاطر تواضع ہوتی رہی ۔ دن میں دو تین مرتبہ دانے دری پر ڈال دیتا ۔ ایک ایک کرکے آتے اور ایک ایک دانہ چن لیتے ۔کبھی دانہ ڈالنے میں دیر ہوجاتی ، تو قلندر آکر چوں چوں کرنا شروع کردیتا کہ وقت معہود گزر رہا ہے ۔ اس صورت حال نے اب اطمینان دلا دیا تھا کہ پردۂ حجاب اُٹھ چکا ، وہ وقت دور نہیں کہ رہی سہی جھجک نکل جائے :

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں "

(غبارِ خاطر۔ص 216-218)

مولانا آزاد چڑیوں کی حرکات وسکنات کا مطالعہ قریب ترین فاصلے سے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی ایک تجربات کئے :

" چند دنوں کے بعد میں نے اس معاملہ کا دوسرا قدم اٹھایا ۔ سگرٹ کے خالی ٹین کا ایک ڈھکنالیا ، اس میں چاول کے دانے ڈالے اور ڈھکنا دری کے کنارے رکھ دیا ۔فوراً مہمانوں کی نظر پڑی ۔ کوئی ڈھکنے کے پاس آکر منہ مارنے لگا ، کوئی ڈھکنے کے کنارے چڑھ کر زیادہ جمعیت خاطر کے چُگنے میں مشغول ہوگیا ۔ آپس میں رقیبانہ ردوکد بھی ہوتی رہی ۔ جب دیکھا کہ اس طریق ضیافت سے طبیعتیں آشنا ہوگئی ہیں تو دوسرے دن ڈھکنا دری کے کنارے سے کچھ ہٹا کر رکھا ۔ تیسرے دن اور زیادہ ہٹادیا اور بالکل اپنے سامنے رکھ دیا۔ گویا اس طرح بتدریج بُعد سے قُرب کی طرف معاملہ بڑھ رہا تھا ۔

اتنا قُرب دیکھ کر پہلے تو مہمانوں کو کچھ تامل ہوا ۔ دری کے پاس آگئے ، مگر قدموں میں جھجک تھی اور نگاہوں میں تذبذب

بول رہا تھا ۔لیکن اتنے میں قلندرؔاپنے قلندرانہ نعرے لگاتا ہوا آپہنچا اور اس کی رندانہ جراتیں دیکھ کر سب کی جھجک دور ہوگئی ، گویا اس راہ میں سب قلندرؔ ہی کے پیرو ہوئے ۔ جہاں اس کا قدم اٹھا ، سب کے اٹھ گئے ۔ وہ دانوں پر چونچ مارتا ، پھر سر اٹھاکے اور سینہ تان کے زبان حال سے مترنم ہوتا ۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو پھر ایک قدم اور اٹھایا گیا اور دانوں کا برتن دری سے اٹھاکے تپائی پر رکھ دیا ۔ یہ تپائی میرے بائیں جانب صوفے سے لگی رہتی ہے اور پوری طرح میرے ہاتھ کی زد میں ہے ۔ اس تبدیلی سے خوگر ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بار بار آتے اور تپائی کے چکر لگاکے چلے جاتے ۔ بالآخر یہاں بھی قلندر ہی کو پہلا قدم بڑھانا پڑا ، اور اس کا بڑھنا تھا کہ یہ منزل بھی پچھلی منزلوں کی طرح سب پر کھل گئی ۔ اب تپائی کبھی تو ان کی مجلس آرائیوں کا ایوان طرب بنتی ، کبھی باہمی معرکہ آرائیوں کا اکھاڑا ۔ جب اس قدر نزدیک آجانے کے خوگر ہوگئے تو میں نے خیال کیا ، اب معاملہ کچھ اور بڑھایا جاسکتا ہے ۔ ایک دن صبح یہ کیا کہ چاول کا برتن صوفے پر ٹھیک اپنی بغل میں رکھ دیا اور پھر لکھنے میں اس طرح مشغول ہوگیا ، گویا اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں ۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا سنتا ہوں کہ زور زور سے چونچ مارنے کی آواز آرہی ہے ۔کنکھیوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہمارا پرانا دوست قلندر پہنچ گیا ہے اور بے تکان چونچ مار رہا ہے ۔ ڈھکنا چونکہ بالکل پاس دھرا تھا ، اس لیے اس کی دُم میرے گھٹنے کو چھو رہی تھی ۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے یاران تیزگام بھی پہنچ گئے ، اور پھر تو یہ حال ہوگیا کہ ہر وقت دو تین دوستوں کا حلقۂ بے تکلف میری بغل میں اچھل کود کرتا رہتا ۔ کبھی کوئی صوفے کی پشت پر چڑھ جاتا ، کبھی کوئی جست لگاکر کتابوں پر کھڑا ہوجاتا ، کبھی نیچے

اتر آتا اور چوں چوں کرکے پھر واپس آجاتا ۔ بے تکلفی کی اس اچھل کود میں کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کاندھے کو درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ سمجھ کر اپنی جست و خیز کا نشانہ بنانا چاہا لیکن پھر چونک کر پلٹ گئے ، یا پنجوں سے اُسے چھوا اور اوپر ہی اوپر نکل گئے ۔ گویا ابھی معاملہ اس منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا ۔

بہر حال رفتہ رفتہ ان آہوان ہوائی کو یقین ہوگیا کہ یہ صورت جو ہمیشہ صوفے پر دکھائی دیتی ہے ، آدمی ہونے پر بھی آدمیوں کی طرح خطرناک نہیں ہے ۔ دیکھیے ، محبت کا افسوں جو انسانوں کو رام نہیں کرسکتا ، وحشی پرندوں کو رام کرلیتا ہے ۔

بار ہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو ، لکھنے میں مشغول ہوں ۔ اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوک قلم پر آگئی ، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پرکیف شعر یاد دلا دیا اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا سروشانہ ہلنے لگا ، یا منہ سے " ہا " نکل گیا ، اور یکایک زور سے پروں کے اڑنے کی ایک پھر سی آواز سنائی دی ۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یاران بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا ۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے ، تو گھبراکر اڑ گئے ۔ عجب نہیں ، اپنے جی میں کہتے ہوں ، یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے ۔ "

(غبار خاطر ۔ ص 218-221)

آہستہ آہستہ چڑیاں اور چڑے مولانا سے بلا خوف وخطر اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے بلکہ انہیں مولانا کے وجود کا احساس بھی جاتا رہا :

"ان یاران سقف و محاریب میں اور مجھ میں اب خوف و تذبذب کا ایک ہلکا سا پردہ حائل رہ گیا تھا ، چند دنوں میں وہ بھی اٹھ گیا

انہیں چھت سے صوفے پر اترنے کے لیے چند درمیانی منزلوں کی ضرورت تھی۔ اب یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلی منزل کا کام پنکھے کے دستوں سے لیتے اور دوسری کا میرے سر اور کاندھوں سے۔ باہر اڑتے ہوئے کمرے میں آئے اور سیدھے اپنے گھونسلے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے سر نکال کر ہر طرف نظر دوڑائی اور پورے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ پھر وہاں سے اڑے اور سیدھے پنکھے کے دستے پر پہنچ گئے۔ پھر دستے سے جو کودے تو کبھی میرے سر کو اپنے قدموں کی جولانگاہ بنایا کبھی کاندھوں کو اپنے جلوس سے عزت بخشی۔ دیکھیے ان چڑیوں نے نہیں معلوم کتنے برسوں کے بعد مومنؔ خان کا ترکیب بند یاد دلا دیا :

جولاں کو ہے اس کی قصد پامال

اے خاک ! نوید سرفرازی

پہلی دفعہ تو اس ناگہانی نزول اجلال نے مجھے چونکا دیا تھا اور شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چونک کر ہل گیا تھا۔ قدرتی طورپر ان آشنایان زود کسل پر یہ ناقدر شناسی گراں گزری ہوگی ! لیکن یہ جو کچھ ہوا محض ایک اضطراری سہو تھا۔ طبیعت فوراً متنبہ ہوگئی اور پھر تو سر اور کاندھا کچھ ایسا بے حس ہوکر رہ گیا کہ منارہ کی چھتری کی جگہ بالا خانے کا کام دینے لگا۔ پنکھے سے اتر کر سیدھے کاندھے پر پہنچتے ، کچھ دیر چہچہاتے اور پھر کود کر صوفے پر پہنچ جاتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کاندھے سے جست لگائی اور سر پر جا بیٹھے۔...... "

(غبار خاطر۔ ص222-223)

مولانا آزاد سے چڑیاں کس قدر بے تکلف ہوگئیں تھیں اس کا مشاہدہ ذیل میں کیا جا سکتا ہے :

” جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ، تو خیال ہوا ، اب ایک اور تجربہ بھی کیوں نہ کرلیا جائے ! ایک دن صبح میں نے دانوں کا برتن کچھ دیر تک نہیں رکھا ۔ مہمانان باصفا بار بار آئے ، اور جب سفرۂ ضیافت دکھائی نہیں دیا تو اِدھر اُدھر چکر لگانے اور شور مچانے لگے۔ اب میں نے برتن نکال کے ہتیلی پر رکھ لیا اور ہتیلی صوفے پر رکھ دی ۔ جونہی قلندرکی نظر پڑی ، معاً جست لگائی اور ایک چکر لگاکے انگوٹھے پر آکھڑا ہوا اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے لگا ۔ اس تیزی میں کچھ تو طبع قلندرانہ کا قدرتی تقاضا تھا اور کچھ یہ وجہ بھی ہوگی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا ۔ چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اڑاڑ کر ڈھکنے سے باہر گرنے لگے ۔ ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس بھی گر گیا ، اس نے فوراً وہاں بھی ایک چونچ ماردی اور ایسی خار اشگاف ماری کہ کیا کہوں ، اگر ان ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہوچکا ہوتا ، تو یقین کیجیے ، بے اختیار منہ سے چیخ نکل جاتی ۔ اب میں نے ہتھیلی برتن سمیت اوپر اٹھالی اور ہوا میں معلق کردی ۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ ایک دوسری چڑیا آئی ۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا نام موتی ہے ۔ موتی نے ہتھیلی کے اوپر ایک دو چکر لگائے اور نکل گئی ۔ گویا اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ اس جزیرے پر اترنے کے لیے محفوظ جگہ کون سی ہوگی ۔ پھر دوبارہ آئی اور کہنی کے پاس اتر کر سیدھی پہنچے تک پہنچ گئی اور پہنچے سے ہتھیلی کی خاکنائے پر اتر کر بے تکان ” منقار درازیاں “ شروع کردیں ۔ اس میں کوئی دانہ قاب کے باہر گرگیا تو چونچ کا ایک نشتر اس پر بھی لگا دیا ۔ دیکھیے ” دست درازی “ کی ترکیب میں تصرف کرکے مجھے ” منقار درازی “ کی ترکیب وضع کرنی پڑی ۔ جانتا ہوں کہ محاورات میں تصرفات کی گنجائش نہیں ہوتی ، مگر

کیا کیا جائے ، سابقہ ایسے یاران کو تہ آستین سے آپڑا ، جو ہاتھ کی جگہ منہ سے "درازدستیاں" کرتے ہیں " (غبارِ خاطر۔ص 223-224)

چڑیوں کے مطالعہ کا ایک آخری تجربہ ملاحظہ ہو۔ جس میں مولانا وہاں کی سب سے خوبصورت چڑیا کو جس کا نام انہوں نے موتی رکھا تھا۔ جمادام قلعہ احمد نگر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح مقابلۂ حسن میں جس کے خطاب سے نوازا جاتا ہے :

" اس آخری تجربے نے طبع کاوش پسند کو ایک دوسری ہی فکر میں ڈال دیا ذوقِ عشق کی اس کوتاہی پر شرم آئی کہ ہتھیلی موجود ہے اور میں نامراد ٹین کے ڈھکنے پر ان منقاروں کی نشتر زنی ضائع کررہا ہوں میں نے دوسرے دن ٹین کا ڈھکنا ہٹا دیا چاول کے دانے ہتھیلی پر رکھے اور ہتھیلی پھیلا کر صوفے پر رکھ دی سب سے پہلے موتی آئی اور گردن اٹھا اٹھاکے دیکھنے لگی کہ آج ڈھکنا کیوں دکھائی نہیں دیتا ! یہ اس بستی کی سب سے زیادہ خوبصورت چڑیا ہے ۔ آج کل حسن کی نمائشوں میں خوبروئی اور دلاویزی کا جو فتنہ گر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے اسے پورے ملک کی نسبت سے موسوم کردیا کرتے ہیں مثلاً کہیں گے مس انگلینڈ ، مادی موازیل (Mademoiselle) فرانس ۔ گویا ایک حسین چہرے کے چمکنے سے سارے ملک و قوم کا چہرہ دمک اٹھتا ہے اگر یہ طریقہ موتی کے لیے کام میں لایا جائے تو اسے مادام قلعہ احمد نگر سے موسوم کرسکتے ہیں ۔ چھریرا بدن ، نکلتی ہوئی گردن ، مخروطی دُم اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولا پن ۔ جب دانہ چگنے کے لیے آئے گی تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائے گی ۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں ، مگر نگاہیں گویا ہوگئی ہیں وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے ، میں نے اس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے ۔ بہر حال اس موقعہ پر بھی اس کی بے ساختہ نگاہوں نے مجھ سے کچھ کہا اور

پھر بغیر کسی جھجک کے جست لگاکے انگوٹھے کی جڑ پر آکھڑی ہوئی اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کردیا ۔ یہ چونچ نہیں تھی ، نشتر کی نوک تھی ، جو اگر چاہتی تو ہتھیلی کے آر پار ہوجاتی ، مگر صرف چرکے لگالگا کے رک جاتی تھی ۔ ہر مرتبہ گردن موڑ کے میری طرف دیکھتی بھی جاتی تھی ۔ گویا پوچھ رہی تھی کہ درد تو نہیں ہورہا ؟ بھلا ، میں جاں باختہ ، لذت الم اس کا کیا جواب دیتا ۔

درد کا حال تو معلوم نہیں ، مگر چونچ کی ہر ضرب جو پڑتی تھی ہتھیلی کی سطح پر ایک گہرا زخم ڈال کے اٹھتی تھی ۔ "
(غبارِ خاطر۔ص 225-226)

انسانی کرداروں کی طرح مولانا نے وہاں کے دو چڑوں کے نام ان کے برتاؤ کے لحاظ سے ملّا اور صوفی تجویز کیا تھا۔ ان کے ناموں کی موزونیت کا استدلال وہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

" اس بستی کے اگر عام باشندوں سے قطع نظر کرلی جائے تو خواص میں چند شخصیتیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ۔ قلندرؔ اور موتیؔ سے آپ کی تقریب ہوچکی ہے ۔ اب مختصراً ملّاؔ اور صوفیؔ کا حال بھی سن لیجیے ۔ ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے ۔ جب دیکھو ، زبان فرفر چل رہی ہے اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے جو بھی سامنے آجائے ، دو دو ہاتھ کیے بغیر نہیں رہے گا ۔ کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے ۔ کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی ، لیکن پہلے ہی مقابلے میں چت ہوگئے ۔ جب کبھی فرش پر یاران شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سرو سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور داہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا فوراً آموجود ہوتا ہے ، اور آتے ہی اچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے ۔ پھر اپنے شیوہ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں ، چوں چاں شروع کردیتا ہے ۔ فرمائیے ، اگر اس کا نام ملّا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا ؟ ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے ۔ تعرف

الاشیاء باضد ادہا ۔ اسے جب دیکھیے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے ۔ بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن کا سا نہیں ہوتا ، بلکہ ایک ایسی آوازہوتی ہے ، جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو ، اور کبھی کبھی سر اٹھاکے " ہا " کردیتا ہو ۔ دوسرے چڑے اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں ، گویا اس کی کم سخنی سے عاجز آگئے ہیں ۔ پھر بھی اس کی زبان کھلتی نہیں ۔ البتہ نگاہوں پر کان لگائیے ، تو ان کی صدائے خاموشی سنی جاسکتی ہے ۔ میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفیؔ رکھ دیا- ...... "

(غبارِ خاطر۔ص 226-228)

مولانا نے چڑیوں کے مختلف انداز میں نہانے اور ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے کے عوامل کی منظرنگاری بڑے ہی دلچسپ انداز میں کی ہے :

" صبح جب اس بستی کے تمام باشندے باہر نکلتے ہیں ، تو برآمدہ اور میدان میں عجیب چہل پہل ہونے لگتی ہے ۔ کوئی پھول کے گملوں پر کودتا پھرتا ہے ۔ کوئی کروٹین کی شاخوں میں جھولا جھولنے لگتا ہے ۔ ایک جوڑے نے غسل کا تہیہ کیا اور اس انتظار میں رہا کہ کب پھولوں کے تختوں پر پانی ڈالا جاتا ہے ۔جونہی پانی ڈالا گیا ، فوراً حوض میں اتر گیا اور پروں کو تیزی کے ساتھ کھولنے اور بند کرنے لگا ۔ ایک دوسرے چڑے کو آس پاس پانی نہیں ملا تو فتیمّموا صعیداً طیباً پڑھتا ہوا مٹی ہی میں نہانا شروع کردیا ۔ پہلے چونچ مار مار کے اتنی مٹی کھود ڈالی کہ سینے تک ڈوب سکے ۔ پھر اس گڑھے میں بیٹھ کر اس طرح پاکو بیاں اور پرافشانیاں شروع کردیں کہ گرد و خاک کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلے پر مّلاحسب معمول کسی حریف سے کشتی لڑنے میں مشغول ہے ۔ ان کے لڑنے کی خود فروشیوں کا بھی عجیب حال ہوتا ہے :

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یعنے ہاتھ کو دیکھیے تو ہتھیار سے یک قلم خالی ہے ، بلکہ سرے سے ہاتھ ہے ہی نہیں:

دہن کا ذکر کیا ، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

مگر چونچ کو دیکھیے ،تو سارے ہتھیاروں کی کمی پوری کررہی ہے۔ جوش غضب میں آکر اس طرح ایک دوسرے سے گتھ جائیں گے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا دشوار ہوجائے گا۔ ہوا میں جب کُشتی لڑتے ہوئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے ہیں تو انہیں اس کا بھی ہوش نہیں رہتا کہ کہاں گر رہے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے سر پر گر پڑے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹھیک میری گود میں آکر پڑگئے۔ میں نے ایک کو ایک ہاتھ سے ، دوسرے کو دوسرے سے پکڑ لیا :

میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

سارا جسم مٹھی میں بند تھا۔ صرف گردنیں نکلی ہوئی تھیں۔ دل اس زور سے دھڑ دھڑ کررہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب پھٹا ، اب پھٹا۔ لیکن اس پر بھی ایک دوسرے کو چونچ مارنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ جب میں نے مٹھیاں کھول دیں ، تو پھر سے اڑ کر پنکھے کے دستے پر جا بیٹھے اور دیر تک چوں چوں کرتے رہے۔ ...... "

(غبارِ خاطر۔ص 228-229)

گھونسلے میں موجود اپنے بچوں کے لیے غذا کی فراہمی چڑیوں کی ایک اہم ذمہ داری ہوتی ہے اور جب تک بچے خود اپنی غذا کا انتظام نہیں کر سکتے اس وقت تک چڑیاں دن بھر یہ عمل دہراتی رہتی ہیں:

" موتی کے گھونسلے سے ایک بچے کی آواز عرصے سے آرہی تھی۔ وہ جب دانوں پر چونچ مارتی تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی ، اور فوراً گھونسلے کا رخ کرتی۔ وہاں اس کے پہنچتے ہی بچے کا شور شروع ہوجاتا۔ ایک دو سکنڈ کے بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اڑ

جاتی ۔ ایک مرتبہ میں نے گنا تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی

جن علمائے علم الحیوان نے اس جنس کے پرندوں کے خصائص کا مطالعہ کیا ہے ، ان کا بیان ہے کہ ایک چڑیا دن بھر کے اندر ڈھائی سو سے تین سو مرتبہ تک بچے کو غذا دیتی ہے ، اور اگر دن بھر کی مجموعی مقدار غذا بچے کے جسم کے مقابلے میں رکھی جائے تو اس کا حجم (Mass) کسی طرح بچے کے جسمانی حجم سے کم نہ ہوگا مگر بچوں کی قوت ہاضمہ اس تیزی سے کام کرتی رہتی ہے کہ ادھر دانہ ان کے اندر گیا اور ادھر تحلیل ہونا شروع ہوگیا ۔ یہی وجہ ہے کہ پرندوں کے بچوں کے نشوونما کا اوسط چار پایوں کے بچوں کے اوسط سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور بہت تھوڑی مدت کے اندر وہ بلوغ تک پہنچ جاتے ہیں ۔ موتی کی رفتار عمل سے مجھے اس بیان کی پوری تصدیق مل گئی ۔ "

(غبار خاطر ۔ ص 229-230)

چڑیوں کے لئے اپنے بچوں کو غذا فراہم کرنے کے علاوہ ان کو اڑنا سکھانا بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ جب بچوں کے پر نکل آتے ہیں تو چڑیاں انہیں گھونسلے سے باہر لے آتی ہیں اور اڑنا سکھانے کی کوشش کرتی ہیں ۔ ان امور کی تفصیلات کا جو مولانا نے مشاہدہ کیا تھا اسے یوں بیان کرتے ہیں :

" جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں ، وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کردیتا ہے کہ اب انہیں اڑنے کا سبق سکھانا چاہیے ۔ معلوم ہوتا ہے ، موتی کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہوگئی تھی ۔ ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں ، گھونسلے سے اڑتی ہوئی اتری تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا ۔ موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اڑنے کا اشارہ کرکے اوپر کی طرف اڑنے لگتی

لیکن بچے میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی ، وہ پر پھیلائے آنکھیں بند کیے ، بے حس و حرکت پڑا تھا ۔ میں نے اسے اٹھاکے دیکھاتو معلوم ہوا ،ابھی پر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں ۔ گرنے کی چوٹ کا اثر بھی تازہ ہے اور اس نے بے حال کردیا ہے۔ ......

بہر حال اسے اٹھاکے دری پر رکھ دیا ۔ موتی چاول کے ٹکڑے چن چن کر منہ میں لیتی اور اسے کھلا دیتی ۔ وہ منہ کھولتے ہی چوں چوں کی ایک مدھم اور اکھڑی سی آواز نکال دیتا اور پھر دم بخود ، آنکھیں بند کیے پڑا رہتا ۔ پورا دن اسی حالت میں نکل گیا ۔ دوسرے دن بھی اس کی حالت ویسی ہی رہی ۔ ماں صبح سے لے کر شام تک برابر اڑنے کی تلقین کرتی رہی ۔ مگر اس پر کچھ ایسی مردنی سی چھاگئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا ۔ میرا خیال تھا کہ یہ اب بچے گا نہیں ۔ لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا ۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرہ کے اندر دور تک چلی گئی تھی ۔ یہ اس میں جاکر کھڑا ہوگیا تھا ، پر گرے ہوئے، پاوں مڑے ہوئے ، آنکھیں حسب معمول بند تھیں ۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے ۔ پھر گردن آگے کرکے فضا کی طرف دیکھنے لگا ۔ پھر گرے ہوئے پروں کوسکیٹرکر ایک دو مرتبہ کھولا ، بند کیا ، اور پھر جو ایک مرتبہ جست لگاکر اڑا ،تو بیک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اڑ کر نظروں سے غائب ہوگیا ۔ یہ منظر اس درجہ عجیب اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی نگاہوں پر شبہہ ہونے لگا کہیں کسی دوسری چڑیا کو اڑتے دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑگیا ہوں ، لیکن ایک واقعہ جو ظہور میں آچکا تھا ، اب اس میں شبہہ کی گنجائش کہاں باقی رہی تھی ! کہاں تو بے حالی اور درماندگی کی یہ حالت کہ دو دن تک ماں سرکھپاتی رہی ، مگر زمین سے بالشت بھر

بھی اونچا نہ ہوسکا اور کہاں آسمان پیمائیوں کا یہ انقلاب انگیز جوش کہ پہلی ہی اڑان میں عالم حدود و قیود کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور فضائے لامتناہی کی ناپید اکنار وسعتوں میں گم ہوگیا ! کیا کہوں ، اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کردی تھی ...... " (غبار خاطر ۔ ص 230-231)

مولانا آزاد چڑیا کے بچہ میں احساس خودشناسی کے جاگنے کو کہ وہ پرندہ ہے اور اس کا کام اڑنا ہے زندگی کے افسانے سے تعبیر کرتے ہیں :

" دراصل یہ کچھ نہ تھا ، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا ، جو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے ، مگر ہم اسے سمجھنا نہیں چاہتے ۔ اس چڑیا کے بچے میں اڑنے کی استعداد ابھر چکی تھی ۔ وہ اپنے کنج نشیمن سے نکل کر فضائے آسمانی کے سامنے آکھڑا ہوا تھا ، مگر ابھی تک اس کی " خود شناسی " کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا ۔ وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا ۔ ماں بار بار اشارے کرتی تھی ، ہوا کی لہریں بار بار پروں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں ، زندگی اور حرکت کا ہنگامہ ہر طرف سے آآکر بڑھاوے دیتا تھا ۔ لیکن اس کے اندر کا چولھا کچھ اس طرح ٹھنڈا ہورہا تھا کہ باہر کی کوئی گرمجوشی بھی اسے گرم نہیں کرسکتی تھی ۔

لیکن جونہی اس کی سوئی ہوئی " خود شناسی " جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوگیا کہ " میں اڑنے والا پرند ہوں " اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی ۔ وہی جسم زار جو بے طاقتی سے کھڑا نہیں ہوسکتا تھا ، اب سر وقد کھڑا تھا ۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی سہار نہیں سکتے تھے ، اب تن کر سیدھے ہوگئے تھے ۔ وہی گرے ہوئے پر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی ، اب سمٹ سمٹ کر اپنے

آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوش پرواز کی ایک برق وار تڑپ نے اس کا پورا جسم ہلاکر اچھال دیا۔ اور پھر جو دیکھا تو درماندگی اور بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور مُرغ ہمت، عقاب وار فضائے لامتناہی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کررہا تھا ......

گویا بے طاقتی سے توانائی ، غفلت سے بے داری ، بے پر و بالی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن میں ہوگیا۔ غور کیجیے۔ تو یہی ایک چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے۔ " (غبارخاطر۔ص 231-232)

"چڑیا چڑے کی کہانی" جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی قابل غور وفکر بھی۔ چنانچہ قاضی عبدالغفار اس کے بارے میں "آثارابوالکلام" میں کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :

" ایک چڑیا کی زندگی سے مولانا کی ذہانت کا ایسا ربط دیکھتے ہیں جو مخصوص فطری رجحانات اور نہایت بیدار قوتِ مشاہدہ کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ کہانی جس مزاحی اور ہلکے لٹریچر کے انداز میں لکھی گئی ہے ، وہ بھی ایک خصوصیت ہے جو صرف کسی ایسے ہی ادیب کے حصے میں آتی ہے ، جس کے قلم اور افکار میں پوری ہم آہنگی قائم ہو۔ ادب کی تخلیق کے ایسے نمونے اپنے آپ ہی مثال ہوتے ہیں۔ چڑیاکے بچے کی خود شناسی کے علاوہ بھی اس کہانی میں بہت کچھ ہے جو تبصرہ کے قابل ہے۔ یوں تصور کیجیے کہ قلعہ احمد نگر کے قیدیوں کی اس بستی میں انسانوں کی ہر بستی کی طرح یہ چڑیاں بھی آباد ہیں۔ مولانا اپنے کمرے کی خلوت میں ان آباد کاروں کی روزانہ زندگی کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ۔ اس مطالعے کے نتائج " غبار خاطر" کے ایک مکتوب میں اس طرح مندرج ہوگئے ہیں کہ گویا ایک مورّخ نے قلعہ احمد نگر کی چڑیوں کے اس خاندان کو لازوال بنا دیا ہے۔ "

(جدید ہندوستان کے معمار، ابوالکلام آزاد۔عرش ملسیانی۔ص 117)

نامور انگریزی ادیب اور پرندوں کے دوست Malcom McDonald سابق ہائی کمشنر برطانیہ برائے ہند "چڑیا چڑے کی کہانی" پڑھنے کے بعد لکھتے ہیں:

"...... اس کہانی میں وہی لطافت و ظرافت موجود ہے جو عام طورپر مولانا کی تحریر و تقریر میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس میں چڑیوں کے عادات و اطوار پر ایسے صحیح مشاہدات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا کا اس طرف میلان طبع ہوتا تو وہ ایک ممتاز ماہر حیوانات ثابت ہوتے۔"

(کتاب التذکرہ ۔ ہمایوں کبیر۔ ص 216)

بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر طیوریات ڈاکٹر سالم علی نے، جن کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ برصغیر کے ہر پرندے کا مطالعہ کر چکے ہیں، 19 دسمبر 1978 کو آزاد میموریل لکچر میں "غبار خاطر" میں "چڑیا چڑے کی کہانی" کے حوالے سے مولانا آزاد کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

"The intimate familiarity fanned his interest in the sparrows and prompted him to record his penetrating observations on the temperament, idiosyncrasies, social behaviour and marital relations of each individual, with an insight that would do justice to a trained naturalist".

INDIA'S MAULANA
Centenary Volume I
Page :31-32

غرض ان تمام باتوں سے "غبارِ خاطر" میں سائنسی حقیقتوں کے پرتو کا اور مولانا آزاد کے سائنسی مزاج اور سائنسی رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔

البیرونی اور جغرافیۂ عالم
ایک تجزیاتی مطالعہ

مولانا ابوالکلام آزاد کو علم فلکیات سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ''الہیت'' کے عنوان سے ایک کتاب کی تحریر کا آغاز کیا تھا جو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پائی۔ چونکہ مولانا کو الہیت سے حد درجہ دلچسپی اسی وجہ سے انہوں نے البیرونی جیسے ماہر الہیت اور جغرافیۂ عالم میں اس کے کارہائے نمایاں پر ایک مقالہ بعنوان ''البیرونی اور جغرافیۂ عالم'' تحریر کیا تھا۔ ان کی سیاسی مصروفیتیں اور بار بار کی نظر بندی نے غالباً انہیں اس بات کی مہلت نہ دی کہ وہ اس مقالہ کو شائع کرواتے۔ چنانچہ مولانا آزاد کا یہ مقالہ کتابی شکل اختیار نہ کر سکا۔ بلکہ عوام الناس کو تو ایسے کسی مخطوطے کا علم بھی نہ تھا۔ بقول مسیح الحسن مصنف ''حواشی ابوالکلام'' کے، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اس مخطوطے کا تذکرہ اپنی کتاب ''ابوالکلام آزاد'' (1968ء) میں پہلی بار کیا تھا اور شائد اسی کی شہادت میں عرش ملسیانی نے اپنی تصنیف ''ابوالکلام آزاد'' (1974ء) میں اس کا حوالہ دیا تھا۔

مولانا آزاد کا یہ مخطوطہ انڈین سنٹر فار کلچرل ریلشنز ICCR 'آزاد بھون' نئی دہلی کے گوشۂ آزاد میں محفوظ ہے۔ اس کو کتابی شکل دینے کا سہرا پروفیسر ضیا الحسن فاروقی اور مسیح الحسن کے سر جاتا ہے۔ ضیا الحسن فاروقی نے اس کتاب پر ''ابوریحان البیرونی'' کے زیر عنوان مقدمہ لکھا اور مسیح الحسن نے ''کچھ مخطوطے کے بارے میں'' کے عنوان سے اس کی تفصیلات بیان کیں۔ مسیح الحسن دوران ملازمت ICCR میں مامور تھے اور انھوں نے اس مخطوطے کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ راقم الحروف بھی آزاد بھون میں اس مخطوطے کا مشاہدہ کر چکا ہے۔ اس کا کاغذ بوسیدہ ہو چکا ہے۔ مزید بوسیدگی سے بچانے کے لئے اس کے ہر ورق پر Butter Paper چڑھا کر ایک شوکیس میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ مسیح الحسن اس قلمی مخطوطے کے بارے

میں لکھتے ہیں کہ وہ $13\frac{1}{2}$x"17 سائز کے 53 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے چند صفحات پر مولانا کے قلم سے بعض اصلاحیں بھی ہیں اوران کے خیال میں یہ مقالہ 1940ء اور 1950ء کے درمیان لکھا گیا ہوگا۔

کتاب'' البیرونی اور جغرافیہ عالم'' ڈیمائی 1/8 سائز کے 112 صفحات پر مشتمل ہے جس کو جولائی 1980 میں شائع کیا گیا اوراس کی قیمت 15 روپے مقرر کی گئی۔ذاکرحسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے تقسیم کار کے فرائض انجام دیئے۔اس کتاب کی اشاعت ثانی 'پاکستان میں عمل میں آئی۔ جہاں ادارہ تصنیف و تحقیق' کراچی نے فروری 1982ء میں اس کو شائع کیا۔اس کتاب میں آخری صفحات پر چند اضافے کیے گئے ہیں۔ 26 اگست 1927ء کے''الہلال'' میں شائع شدہ مولانا آزاد کا مضمون بعنوان ''ہندوستان اورحکیم ابوریحان'' اور'' غبار خاطر'' سے وہ اقتباسات جن میں ہندوستان اورعرب کا حوالہ بیرونی کی تصنیف'' کتاب الہند'' کے وسیلہ سے ملتا ہے' شامل ہیں۔کتاب کے آخر میں انگریزی اوراس کی متبادل اردو کی وہ اصطلاحات درج کی گئی ہیں جنہیں مولانا آزاد نے مخطوطے میں استعمال کیا تھا۔

البیرونی کا پورانام ابوالریحان محمد بن احمد تھا۔اس کے البیرونی کہلانے سے متعلق مختلف روایتیں ملتی ہیں۔لیکن آج تک اس کی حقیقت کا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔وہ 972ء میں شہرخوارزم سے قریب ایک دیہات کے غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ یہ شہراب روس میں واقع ہے۔اس کا انتقال کب اور کہاں ہوا اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کا انتقال 1050ء کے بعد ہوا۔ البیرونی بچپن ہی سے نہایت ذہین تھا اوراس نے بڑا بلند حوصلہ پایا تھا۔غریبی کی وجہ سے اس کو بہت سی مشکلات کا سامنا رہا اس کے باوجود وہ علوم کے حصول اور معلومات کی تحقیق میں جٹا رہا۔ اس نے کئی زبانوں پر عبور حاصل کیا جن میں عربی' عبرانی' سریانی' سغدی اور خوارزمی (فارسی کی دوصورتیں) اور سنسکرت شامل ہیں۔ اس کی علمی زبان عربی تھی۔اپنی انتھک محنت اور مشقت کی بنا پر بہت جلد علم ہیئت' فلسفہ' نجوم' تاریخ' جغرافیہ' ریاضی' ارضیات اور آثار قدیمہ پر قدرت حاصل کی۔ اس نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ایک راوی کے مطابق اس نے ساٹھ اوراق پر لکھی ہوئی البیرونی کی کتابوں کی فہرست دیکھی تھی۔ان میں سے کئی کتابیں آج ناپید ہو چکی ہیں۔البیرونی کو اس دنیا سے گزرے ہوئے صدیاں

بیت چکی ہیں لیکن آج بھی اس کی تحقیقات میں تازگی پائی جاتی ہے اور دور حاضر کے محقق اور سائنسداں ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ البیرونی کے علوم کے جاننے اور اس کی کتابوں کی تصنیف سے متعلق ضیاء الحسن فاروقی اپنے مقدمہ میں یوں رقم طراز ہیں :

''البیرونی کی جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں یا اسکی بعض کتابوں کے جو ترجمے میں نے دیکھے ہیں ' ان کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے اسے علوم قطعیہ میں تحقیق و تدقیق ہی کے لئے پیدا کیا تھا۔ ریاضی اور ریاضیاتی علوم کے میدان میں اس کی فکری و تجربی کاوشیں بے پناہ ہیں۔ ہئیت ' علم پیمائش ارض (جیوڈیسی) 'علم معدنیات ' نباتات ' علم الانسان ' غرض کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس سے اسے دلچسپی نہ رہی ہو اور جس سے متعلق اس نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ اس کی فلسفیانہ بصیرت سے انکار نہیں کیاجاسکتا ' دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی بصیرت کو جلا ملی تھی مذہب سے ' اور اسی کے سہارے اس نے چند اہم مسائل پر غور و فکر کیا تھا۔ ریاضیاتی علوم کا وجدانی اور استخراجی طرز تحقیق اور طبیعی اور نیچرل سائنس کا تجربی اور استقرائی طرز استدلال ہمیں البیرونی کی تحقیقات اور نگارشات میں ' موضوع کے اعتبار سے جہاں جس کی ضرورت ہوئی ' برابر ملتا ہے ' او ریہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال میں جدید اصول تحقیق کو برتنے والے عالم البیرونی کو اپنے آپ سے بہت قریب پاتے ہیں۔ ''

(ص 22)

البیرونی عقیدہ کا ایک پکا مسلمان تھا۔ اس کی بعض تصنیفات میں قرآنی آیات بطور شہادت اور دلیل کے ملتی ہیں۔ وہ ایک عالم اور فلسفی ہونے کے باوجود کبھی بھی تشکیک میں مبتلا نہیں ہوا اور اس نے اپنے عقیدہ کے اظہار میں بھی کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ مولانا آزاد کا مقالہ '' البیرونی اور جغرافیۂ عالم'' مولانا کی ایک طویل تمہید کے ساتھ درج ذیل عنوانات کے تحت مباحث پر مشتمل ہے۔

(1) البیرونی کا عہد اور عربی فن جغرافیہ وتخطیط (2) ہفت اقلیم (3) اقلیموں کی مساحت اور کرہ کی مجموعی مساحت (4) خط استوا اور رقبۃ الارض (5) ہندوستان کے بعض قدیم مقامات (6) البیرونی کے اطوال اور موجودہ اطوال کا باہمی فرق (7) اس عہد کی جغرافیائی تحقیقات کی بعض خصوصیتیں (8) محمود غزنوی اور البیرونی (9) ہندوستان میں البیرونی کی حدود سیاحت (10) البیرونی کی دماغی سیر (11) الصیدنہ اور الجماہر۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کے دربار سے البیرونی کی وابستگی کے کئی واقعات مشہور ہیں۔ دونوں کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ اس کے تعلقات محمود غزنوی سے ہمیشہ کشیدہ رہے۔ اس لیے البیرونی کو دربار میں سازگار ماحول نہ مل سکا۔ البتہ محمود غزنوی کے انتقال کے بعد جب اس کا بیٹا سلطان مسعود تخت نشین ہوا تو البیرونی کے لئے سازگار ماحول پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ سلطان مسعود علم دوست شخصیت کا مالک تھا، البیرونی نے 1031ء میں ایک جامع کتاب ''القانون'' تصنیف کی اور اس کو سلطان مسعود کے نام معنون کیا' جس کی بنا پر دونوں کے تعلقات مزید استوار ہو گئے۔ اس طرح البیرونی کی زندگی کا آخری زمانہ فراغت اور خوشحالی کا تھا۔ مولانا آزاد اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ماہرین کی رائے میں کتاب ''القانون'' کی اشاعت البیرونی کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ثابت ہوا۔ یہ کتاب گیارہ مقالوں پر مشتمل ہے جس کے ایک مقالہ میں کرۂ ارض کے آباد حصے پر جغرافیائی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ خاص کر دنیا کی تمام آبادیوں کے لئے طول بلد (Longitude) اور عرض بلد (Lattitude) کی جدولیں پیش کی گئی ہیں جو علم جغرافیہ میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا کا یہ ماننا ہے کہ البیرونی علم جغرافیہ کی تاریخ کا وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنے عہد کی دنیا کو مکمل طور پر طول بلد اور عرض بلد میں تقسیم کیا۔ اس کے دور کے بعد اسلامی ممالک میں کئی رصدگاہیں قائم ہوئیں جہاں البیرونی کی جدولوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی اپنی جدولیں ترتیب دی گئیں۔ یہاں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ بعد میں جنہوں نے بھی طول بلد اور عرض بلد کی جدولیں مرتب کیں' ان کی اپنی رصدگاہیں تھیں۔ لیکن البیرونی کی ایسی کوئی رصدگاہ نہیں تھی اس کے باوجود اس نے جدولیں مرتب کی تھی۔ مولانا کی تحریر سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ البیرونی ایک محقق اور مجتہد تھا اور اپنی ذاتی تحقیق اور محنت سے اس نے اس فن کی تدوین کی تھی۔ مولانا نے البیرونی کی تحقیقات اور اس کی معلومات کا مقابلہ دوسرے ماہرین الہیئت سے کیا جن میں اس کے پیشرو عالم،

الادریسی اور متاخر ماہرین شامل تھے اور یہ بتلایا کہ جغرافیہ کی تحقیق وتدوین میں وہ ان سب سے بالاتر تھا۔

''القانون'' کے نسخے کہاں کہاں پائے گئے اور وہ برسہا برس تک کن کن ہاتھوں سے گزرتے رہے، ان کی سرگزشت کی تفصیلات پر مولانا آزاد نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے مطابق ایک نسخہ مختلف ہاتھوں سے گزرتا ہوا کلکتہ کی امپیریل لائبریری پہنچا اور عرصے تک خود ان کے مطالعے میں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا اس کی صحت کے بارے میں نا قابل اعتبار ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ایک اور نسخہ کی نشاندہی کرتے ہیں جو ترکی کے عالم اور استنبول یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد پروفیسر زکی ولیدی توغان کے ہاتھ لگا تھا۔ اس نسخہ کو تصحیح اور ترتیب کے لحاظ سے بنیادی نسخہ قرار دیا گیا۔ مولانا نے استنبول کے کتب خانوں میں البیرونی کی تحریر کردہ ذیل کی تین اور کتابیں دستیاب ہونے کا انکشاف کیا ہے۔

(1) تحدید نہایات الاماکن تصحیح مسافات المساکین یعنی سائنٹفک جیوگریفی کے طریقوں کا بیان۔ (مصنف کے قلم سے لکھا ہوا ہے)

(2) الجماہر فی الجواہر۔ جواہرات کی انواع واقسام کی تحقیق۔

(3) الصیدنہ۔ مفرد دواؤں کی تحقیقات۔

پروفیسر توغان نے ان کتابوں میں موجود جغرافیہ عالم سے تعلق رکھنے والے مواد کو ''القانون'' کی جدول میں شامل کر دیا اور اس مفید اور دلچسپ مجموعہ کو ''صفتہ المعمورۃ علی البیرونی'' یعنی ''بیرونیز پکچر آف دی ورلڈ'' کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت ایک مسئلہ بن گئی۔ ترکی میں عربی کتابوں کی اشاعت پر پابندی لگ چکی تھی۔ اس لئے ترکی سے اس کتاب کی اشاعت کھٹائی میں پڑ گئی۔ چنانچہ پروفیسر توغان کو بڑی ہی دقتوں کا سامنا رہا۔ اور اس کتاب کی اشاعت چودہ برسوں تک التوا میں رہی۔ آخر کار یہ مجموعہ گورنمنٹ آف انڈیا کے آرکیالوجیکل ڈپارٹمنٹ کے زیر اہتمام دہلی میں طبع ہوا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ البیرونی کی ''کتاب الہند'' اور اس کا انگریزی ترجمہ انڈیا آفس لندن کی اعانت سے شائع ہوا تھا۔ جس کے پچپن سال بعد اس کی یہ دوسری کتاب گورنمنٹ آف انڈیا کی اعانت سے شائع ہوئی۔ توغان کی یہ کتاب مولانا کی پرسنل لائبریری میں تھی جس پر ان ہی کے قلم سے ''ابوالکلام آزاد نینی جیل 25 اکتوبر'' درج ہے۔

البیرونی سے پہلے جغرافیہ اور ہیئت کی شاخ ''اسفیریکل اسٹرونومی'' اور ''پریکٹیکل اسٹرونومی'' کو عربی میں کس حد تک فروغ حاصل ہوا تھا؟ اس کے بارے میں مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ البیرونی سے قبل

عربی زبان میں یونانی اور ہندوستانی ماہرین ہیئت وجغرافیہ کی تحقیقات سے استفادہ کیا گیا تھا۔البیرونی کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ابتدائی ترجموں میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں ان کی تلافی ہو۔ چنانچہ اس نے ان علوم کو سنسکرت سے عربی میں منتقل کرنے کی ٹھان لی۔عربی میں علم ہیئت کی سب سے پہلی مستند کتاب جو ترجمہ ہوئی وہ مشہور ہندوستانی ماہر فلکیات اور ریاضی داں براہم گپت کی کتاب" براہم سپھت سدھانت" تھی جس کو ابراہیم بن الحبیب الفزاری نے 628ء میں ترجمہ کی تھی۔لیکن بعد میں یونانی محققین کی علم ہیئت اور جغرافیہ زیادہ مقبول ہوئی۔

مولانا آزاد البیرونی اور القفطی کے حوالے سے ان تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ المنصور العباسی کے دربار میں ایک وفد 771ء میں آیا تھا جس میں ایک شخص علم ہیئت کا ماہر تھا۔خلیفہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے اس شخص کی قدر دانی کی اور خلیفہ کے حکم پر ہی اس نے براہم گپت کی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا۔اس کے بعد خلیفہ المامون کا زمانہ آیا جس نے بطلیموس (Ptolemy) کی یونانی زبان میں لکھی گئی کتاب Magestic کا عربی میں ترجمہ کروایا۔اس کے بعد ہی سے عرب علماء میں ہندوستانی علم ہیئت کی جگہ یونانی علم ہیئت زیادہ مقبول ہوئی۔

مولانا لکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کا زمانہ عربی ریاضیات کی نشوونما کا اہم زمانہ تھا۔اسی عہد میں علم ہیئت کی دو اہم شاخیں" الہیتہ الکروی"اور" الہیتہ التجربی" کو عربی زبان میں نمایاں حیثیت حاصل ہوئی۔یہ اور بات ہے کہ وہ تکمیل کے مراحل تک نہ پہنچ پائیں۔عربی زبان میں دنیا کا پہلا نقشہ المامون کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔اس کے بعد کئی ایک سیاح اور ماہرین جغرافیہ نے اپنی معلومات کی اساس پر نقشے تیار کئے۔ان نقشوں میں سات اقلیموں کی تقسیم کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔اس میں طول بلد اور عرض بلد کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔غالباً چوتھی صدی ہجری میں خط استوا' خط نصف النہار' طول بلد اور عرض بلد دنیا کے نقشہ میں شامل ہوئے۔

مولانا آزاد ہندوستانی علم جغرافیہ کی خامی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کے ماہرین علم ہیئت نے خط استوا کو سیلون (سری لنکا) پر سے گزارا تھا۔یہی نہیں بلکہ شہر اجین کو بھی اسی خط پر بتلایا تھا۔صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں وسائل کی کمی اور رصدگاہوں میں سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی تھی۔لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود ہندوستانی ماہرین نے اس میدان میں جو کارہائے نمایاں

انجام دیے تھے وہ قابل تحسین ہیں۔

مولانا آزاد 'البیرونی کا عہد اور عربی فن جغرافیہ وتخطیط'' کے تحت لکھتے ہیں کہ البیرونی چوتھی صدی ہجری میں پروان چڑھا اور اس کی پختہ عمر میں لکھی گئی کتابیں پانچویں صدی ہجری میں تکمیل کو پہنچیں۔ اس طرح اس کا عہد دونوں صدیوں پر محیط رہا۔ اس زمانے تک علم جغرافیہ اور کرہ ارض کی تخطیط (زمین کا طول بلد اور عرض بلد میں احاطہ) کا فن، عربی زبان میں کہاں تک ترقی پذیر ہوا تھا۔ اس میں کیا خامیاں رہ گئی تھیں اور البیرونی نے اپنی تحقیق کی روشنی میں انہیں دور کرتے ہوئے کس طرح اس میدان میں علمی کارنامے انجام دیے ان تمام موضوعات پر مولانا نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

البیرونی کی تحقیق، تدوین اور تصانیف سے پہلے عربی زبان میں جو کام ہوا تھا اس کے اہم خدوخال اور ان میں کوتاہیاں کچھ اس طرح تھیں۔

(1) علم ہیئت کی شاخیں ''اسفیریک اسٹرونومی'' (Spheric Astronomy) اور ''پریکٹیکل اسٹرونومی'' (Practical Astronomy) عربی زبان میں داخل ہو چکی تھیں لیکن ان کا استعمال بہت کم ہوتا تھا۔

(2) علم جغرافیہ کی کتابیں کثیر تعداد میں لکھی جا چکی تھیں۔ Ptolemy کے پیش کردہ طول بلد اور عرض بلد کو من وعن تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی تھی۔

(3) جغرافیہ کی معلومات عرب، افریقہ، ایشیا کوچک، مغربی ایشیا، روم اور اسپین کی حد تک محدود تھیں۔ وسط ایشیا، ہندوستان، چین اور جزائر غرب الہند کے بارے میں عرب جغرافیہ دانوں کی تحقیقات تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں۔

(4) جغرافیہ کی کتابوں میں سیاحوں کی روایتوں پر مشتمل من گھڑت قصے اور کہانیاں شامل ہو گئی تھیں۔

(5) عربی زبان میں سنسکرت سے جو علوم داخل ہوئے تھے ان میں کافی غلطیاں تھیں۔

مولانا آزاد کے مطابق البیرونی نے ان تمام نکات کا نہ صرف سنجیدگی سے جائزہ لیا بلکہ ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو اپنے علمی تجربوں اور مشاہدوں سے دور کیا۔ البیرونی نے اس ضمن میں جو علمی کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کو کچھ اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔

(1) البیرونی نے اپنے پیشرو ماہرین جغرافیہ کے کام کا از سر نو جائزہ لیا اور ان کی خامیوں کو دور کیا۔

اسفیریک اسٹرونومی اور پریکیٹکل اسٹرونومی میں طے کئے گئے علمی تجربات کی روشنی میں علم جغرافیہ کی بنیاد رکھی اور اس موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔

(2) دنیا کی اس وقت تک معلوم آبادی کے لئے طول بلد اور عرض بلد مرتب کئے۔ پیشرو ماہرین جغرافیہ کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ "القانون" کے علاوہ اس موضوع پر چار کتابیں لکھیں۔

(3) اپنے ذاتی مشاہدے اور تحقیقات کے ذریعہ وسط ایشیا اور ہندوستان کی جغرافیائی تحقیقات کی تکمیل کی۔ چنانچہ ہندوستان سے متعلق اس کی تحقیقات آج بھی نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

(4) البیرونی نے اپنی تحقیقات کو سائنٹفک معیار پر اور جغرافیائی معلومات کو حقائق کی بنیاد پر قائم کیا۔

(5) علم ہیت اور جغرافیہ کی اس نے نئے سرے سے تصحیح کی اور ہندوستانی علوم کو از سرنو عربی میں مدون کیا۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ البیرونی کا طریقہ کار دیگر زبانوں سے علوم کے حصول کے لیے بالکل جداگانہ تھا۔ دوسرے لوگ ترجموں پر اکتفا کرتے تھے لیکن اس نے جس زبان کے بھی علوم میں دلچسپی لی اسی زبان کے ماخذوں سے راست علم حاصل کیا۔ چنانچہ ہندوستانی علوم کی تحصیل اس نے سنسکرت زبان سے کی۔ جس کے لئے اس کو سنسکرت سیکھنی پڑی۔ ایرانی تاریخ وسنین کی تحقیقات کو اس نے فارسی کتابوں سے اخذ کیا۔ ان کے علاوہ اس نے خوارزمی' جرجانی' یونانی' سریانی اور عبرانی زبانوں کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ جب کہ نامور علما الفارابی' بوعلی سینا اور ابن الرشید نے علوم کے حصول کے لئے مختلف زبانوں کے عربی ترجموں پر اکتفا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی تاریخ میں البیرونی کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ البیرونی بدھ مت کی قدیم تاریخ سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسلام کے ظہور میں آنے سے قبل بدھ مت افغانستان میں پھیل چکا تھا اور بامیان اور بلخ میں بدھ مت کے بھکشوؤں کی بڑی بڑی خانقاہیں موجود تھیں۔

مولانا آزاد "ہفت اقلیم" کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور ایران میں دنیا کے آباد خطوں کو سات حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ لیکن یونانیوں نے زمین کے آباد حصوں کو تین براعظموں یورپ' ایشیا اور افریقہ میں تقسیم کردیا تھا۔ جب کہ عربوں نے بھی آباد دنیا کو سات حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ہندوستان اور ایران میں ان سات حصوں کو "ہفت کشور" کہا جاتا تھا اور عرب انہیں "اقالیم السبعہ" کہتے تھے۔ البیرونی

نے اپنی کتاب ''تحدید نہایات الاماکن'' میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ قدیم ایرانی بادشاہوں نے عراق' فارس' الجبال اور خراسان کو دنیا کے آباد حصہ کی درمیانی کڑی قرار دیا تھا اور باقی ممالک کو چھ دائروں میں بانٹ کر اس کے اطراف پھیلا دیا تھا۔ اس طرح ساری دنیا سات دائروں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ جب کہ ہندوستانی ماہرین جغرافیہ نے کرہ ارض کو خشکی اور سمندر دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ پھر خشکی کے نصف کرہ کو انہوں نے سات حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ آج کرہ ارض پر شمال' جنوب' مشرق اور مغرب جن مقامات پر ہیں اس زمانے میں ان کے مقامات بالکل مختلف تھے۔ اوپر جنوب' نیچے شمال' دائیں جانب مغرب اور بائیں جانب مشرق ہوا کرتے تھے۔ کرۂ ارض کو سات اقلیم میں جو تقسیم کیا گیا تھا وہ صرف ایک خیالی تقسیم تھی جس طرح کہ خطوط طول بلد اور عرض بلد ہوا کرتے ہیں۔ البتہ سورج کے طلوع اور غروب کے اوقات کی تقسیم، ٹھنڈے' معتدل' گرم خطوں کے لحاظ سے عمل میں لائی گئی تھی۔ معتدل خطے بیچ میں اور ٹھنڈے و گرم خطے اس کے اطراف حائل رہتے۔ سورج کے طلوع اور غروب میں آدھے آدھے گھنٹے کے فرق سے ان خطوں کو الگ الگ اقلیموں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ البیرونی کے عہد میں اقلیموں کی جتنی بھی جدولیں تیار کر لی گئی تھیں ان میں سے کئی ایک میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ ان کے عروض کے تعین میں مشاہدے اور حساب کی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ ایک جغرافیہ نویس کا حساب دوسرے جغرافیہ نویس کے حساب سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ البیرونی اپنے دور کی تاریخ کا پہلا عالم ہے جس نے علم جغرافیہ میں پیشرو تمام ماہرین کے نقائص کا پتہ لگایا اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں ان کا ازالہ کر کے جغرافیہ کو ٹھوس سائنٹفک بنیادوں پر قائم کر دیا۔ علاوہ اس کے وہ تمام شکوک وشبہات جو قدماء نے اس علم میں پیدا کر دیے تھے ان کو دور کر کے رکھ دیا۔ مولانا آزاد نے بیرونی کے ان کاموں کو ''القانون'' کے عربی حوالوں کو معہ اردو ترجمہ پیش کیا ہے جس میں جابجا البیرونی کی ان کوششوں سے آگہی حاصل ہوتی ہے جو اس نے جغرافیہ کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں کیں۔

مولانا آزاد ''اقلیموں کی مساحت اور کرہ کی مجموعی مساحت'' کے زیر عنوان پروفیسر وائڈمین (E. Wiedemann) کی اس بحث کی اساس پر بات کرتے ہیں جس کو البیرونی نے ''القانون'' کے اس مقالہ کے سلسلہ میں لکھا تھا جس کے مطابق کرہ ارض کی مساحت (قطر) پر البیرونی سے پہلے جتنی بھی تحقیقات عمل میں لائی گئیں ان میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اس کے پیشرو علما میں ہندوستان' یونان اور

عرب کے عالم تھے۔ ان تینوں ملکوں کے ماہرین جغرافیہ نے جو پیائش کی تھی ان کی قیمت میں اور اصلی قیمت میں بہت فرق تھا۔ وہ قیمت یا تو بہت زیادہ تھی یا بہت کم۔ زمانہ وسطیٰ میں دیکھا جائے تو البیرونی ہی ایک ایسا شخص نظر آتا ہے جس کی تحقیقات اس قدر صحیح تھیں کہ اس کی پیش کردہ قیمت زمین کے قطر کی اصلی قیمت سے قریب ترین تھی۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں تمام وسائل کے استعمال کی بنا پر کرہ ارض کے قطر کی قیمت 24858 میل لی جاتی ہے جب کہ البیرونی نے اس کی قیمت 24769 میل بتائی تھی۔ اس طرح البیرونی کی پیش کردہ قیمت اصلی قیمت سے صرف 89 میل کم تھی۔ مولانا آزاد اس حصہ میں یونانی حکماء ارسطو، پسی ڈانیس (Paseidonius) ، بطلمیوس (Ptolemy) ، ہندوستانی حکما پلھس اور برہم گپت اور عرب میں المامون عباسی کے حکم سے کی گئی پیائش سے حاصل شدہ زمین کے قطر کی قیمتیں درج کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ وہ تمام کی تمام قیمتیں آج کی تسلیم شدہ قیمت سے بہت زیادہ فرق رکھتی ہیں۔

''خط استوا اور رقبتہ الارض'' کی سرخی کے تحت مولانا آزاد اس تذکرہ کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہندوستانی ماہرین جغرافیہ میں یہ غلطی عام تھی کہ وہ سری لنکا اور اجین کو خط استوا پر واقع ہونا تسلیم کرتے تھے اور یہ مانتے تھے کہ کرہ ارض کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والا خط نصف النہار، سری لنکا کو قطع کرتا ہے۔ عرب ماہرین کو بھی یہی مغالطہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے سری لنکا کو رقبتہ الارض کے نام سے موسوم کیا۔ ماہرین جغرافیہ میں البیرونی ہی وہ واحد شخص تھا جس نے اس پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ لیکن محدود وسائل کی بنا پر وہ اس کی تصحیح نہ کرسکا۔ سری لنکا کے بارے میں ایک بات اور تھی کہ ہندوستانی پنڈتوں کی رائے میں وہاں بھوت پریت بستے تھے۔ جس کا اظہار البیرونی ''کتاب الہند'' میں کرتا ہے۔ عربوں کے حوالے سے بھی وہ لکھتا ہے کہ عرب، سری لنکا کو ایک پراسرار جزیرہ مانتے تھے۔

''ہندوستان کے بعض قدیم مقامات'' کی ذیلی سرخی کے ذیل میں مولانا آزاد اظہار خیال کرتے ہیں کہ ''کتاب الہند'' کی جدولوں میں ہندوستان کے تمام شہروں، قلعوں اور دریاؤں کے مقامات اور ان کے طول بلد اور عرض بلد کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اور ان مقامات کے قدیم ناموں کو نئے ناموں سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے ایلیٹ، سخاؤ، فیرنڈ، اسٹریک اور مارکوارٹ جیسے جغرافیہ کے ماہرین نے جو کام انجام دیے تھے اس سے پروفیسر توغان نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی کتاب ''صفتہ المعمورہ'' کے حواشی

ترتیب دیے۔

''البیرونی کے اطوال اور موجودہ اطوال کا باہمی فرق'' کے زیرعنوان مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ یونان کے جغرافیہ نویس شمالی افریقہ کے ساحلی جزائر کو خشکی کی انتہا مانتے تھے کیوں کہ جب تک امریکہ دریافت نہیں ہوا تھا۔ طول بلد کے حساب کے لئے ان جزیروں کو صفر مان لیا گیا تھا۔ ابتدا میں عرب جغرافیہ نویسوں نے بھی ان کی پیروی کی لیکن بعد میں چند عرب جغرافیہ نویسوں نے شمالی افریقہ کے ساحل کو صفر مانا۔ اس طرح عرب میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بعض نے جزائر کو صفر مانا تو بعض نے شمالی ساحل کو۔ البیرونی نے جغرافیہ کی کتابوں میں اس اختلاف کو محسوس کیا اور طول بلد کے حساب کے لئے صرف افریقہ کے ساحل کو مبدا قرار دیا اور اس لحاظ سے تمام حسابات کئے گئے اور نقشے تیار ہوئے۔ عہد وسطیٰ کے بعد جب یورپ میں علم وفن کو فروغ حاصل ہوا تو انہوں نے عربوں کے جغرافیائی علم اور نقشوں سے استفادہ حاصل کیا۔ اور یہ محسوس کیا گیا کہ مختلف ممالک میں طول بلد کا صفر مختلف لیا گیا ہے۔ جس میں یکسانیت کی خاطر 1884ء میں واشنگٹن کانفرنس نے غور وفکر کے بعد گرین وچ (Greenwich) لندن کے خط کو صفر تسلیم کرلیا اور آج ساری دنیا اسی کو مانتی ہے۔ چنانچہ جب ہم البیرونی کے تدوین کردہ طول بلد کا حال کے مروجہ طول بلد سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں صرف 26 یا 27 درجوں کا فرق پاتے ہیں۔ عرض بلد میں ایسا کوئی اختلاف نہیں تھا اس لئے ان میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔

البیرونی کو ہندوستان کے اندرونی علاقوں کی سیاحت اور وہاں رصدی تحقیقات کا موقع نہیں ملا۔ اس نے اس بارے میں صرف پنڈتوں' دوسرے سیاحوں اور روایتوں پر انحصار کیا یا پھر ان معلومات سے استفادہ کیا جو عربوں اور یونانیوں کی تصنیفات میں درج تھیں۔ اس کا یہ ماننا تھا کہ ہندوستان کے راویوں اور سیاحوں کے بیانات سے حقیقت کا پتہ لگانا دشوار ہے کیوں کہ ان کے ہاں تو ہم پرستیاں' مبالغہ آرائیاں اور غلط فہمیاں کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اس بات کا اظہار وہ ''کتاب الہند'' میں اس طرح کرتا ہے:

> ''میں نے قلعہ' لاہور کا عرض بلد رصدی عمل کے ذریعہ معلوم کیا تو وہ 34 درجہ 3 دقیقہ کا نکلا۔ لاہور کے علاوہ جن دوسرے شہروں کا عرض بلد میں دریافت کرسکا ہوں ان کے نام یہ

ہیں۔ غزنی ' کابل ' کندی ' رباط الامیر ' دنبور (یعنی موجودہ زمانہ کا جلال آباد) لمغان ' پرشاور (پشاور) ' وے ہند (اٹک) ' جیلم (جہلم) قلعہ نندنہ (ٹلا) ' ملتان ' سیالکوٹ ' مندککور ان مقامات سے ہم آگے نہ بڑھ سکے اور نہ ہندوؤں کی کتابوں سے ہمیں شہروں کے اطوال و عروض کا کچھ پتہ ملا۔ "

(البیرونی اور جغرافیہ عالم۔ص86)

"اس عہد کی جغرافیائی تحقیقات کی بعض خصوصیتیں" عنوان کے تحت مولانا آزاد اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ آج ساری دنیا کے محققین اپنی تحقیقات کا دستیاب ترسیلی نظام کے ذریعہ جس طرح اشتراک کر سکتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں بھی یہ اشتراک شامل حال تھا۔ حالاں کہ اس زمانے میں نہ تو اتنے تیز رفتار ذرائع حمل ونقل تھے اور نہ ہی آج کی طرح کا ترسیلی نظام تھا۔ چنانچہ البیرونی اپنی کتاب "القانون" میں اس بات کا اعتراف کرتا ہے :

" میں نے ابو الوفا محمد بن محمد البوز جانی نے 387 ھ (مطابق 998ء) میں باہمد گرمل کر چاند گرہن کا رصدی عمل انجام دیا میں خوارزم میں تھا ' ابوالوفا بغداد میں تھا ان دونوں مقامات کے اعمال کے نتائج دونوں جگہوں کے خطوط نصف النہار کے قدرتی اختلاف کے ٹھیک مطابق ظہور میں آئے اسی طرح میں کئی بار چاند گرہن کے موقع پر ارصاد کیا اور ہرمرتبہ ایک ہی مقدار ثابت ہوئی اگر کچھ فرق نکلا بھی تو اتناکم کہ مقدار کی پکڑ میں نہیں آسکتا۔ "

(البیرونی اور جغرافیہ عالم۔ص 91-90)

"محمود غزنوی اور البیرونی" کے عنوان کے تحت مولانا آزاد نے ان دونوں کے تعلقات پر پھر ایک بار روشنی ڈالی ہے اور یہ بتلایا کہ البیرونی نے ہندوستان کی سیاحت اور یہاں کے علوم پر تمام کتابیں محمود غزنوی کے دور میں لکھیں۔ حالانکہ ہندوستان کی سیاحت میں البیرونی کی نقل وحرکت پر کئی طرح کی پابندیاں لگائی گئی تھیں۔

اوپر کے صفحات میں اس بات کا تذکرہ آیا ہے کہ البیرونی محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان میں

داخل ہوا۔ یہاں کی سیاحت کی ۔ زبان سیکھی ۔ تہذیب وتمدن کا مطالعہ کیا اور ہندوستانی علوم سے واقفیت حاصل کی ۔ لیکن اس نے ہندوستان میں کن کن علاقوں کی سیر کی اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مولانا آزاد '' ہندوستان میں البیرونی کی حدود سیاحت '' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ البیرونی جب ہندوستان میں داخل ہوا تو یہاں کن کن مقامات کی سیر کی اس کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ اس کی تصنیف '' کتاب الہند '' میں ہندوستانی عوام' ان کی تہذیب' ان کے رہن سہن اور ان کی زبان سنسکرت کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی گئیں ہیں' ان کا مطالعہ ہندوستان کے کس حصہ کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ نے '' کتاب الہند '' کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ البیرونی ہندوستان میں ملتان اور لاہور سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اور ڈاکٹر سخاؤ کی یہ دلیل مسلمہ حقیقت قرار دی گئی تھی ۔ لیکن مولانا آزاد نے جب 1906 ء میں امپیریل لائبریری کلکتہ میں '' القانون المسعودی '' کا مطالعہ کیا تو انہوں نے یہ نتیجہ برآمد کیا کہ البیرونی کی سیاحت صرف پنجاب کی حد تک محدود نہیں تھی وہ ڈاکٹر سخاؤ کی رائے کو قابل نظر ثانی قرار دیتے ہیں ۔ مولانا آزاد اس بات کی دلالت پیش کرتے ہیں کہ البیرونی اپنی کتاب '' القانون '' میں ایک ایسے مقام کا ذکر کرتا ہے جو ہندوستان میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ سمندر کے کنارے تک پہنچنے کے لئے البیرونی کا جنوبی ہند تک پہنچنا بڑا دشوار تھا۔ اس لئے مولانا آزاد کا یہ ماننا تھا کہ وہ سمندری مقام سندھ ہی کا ہوسکتا ہے، اور یوں بھی مولانا کے خیال میں البیرونی پنجاب آئے اور سندھ کے علاقے کی سیاحت نہ کرے' یہ کیوں کر ممکن تھا جب کہ وہ علاقہ محمود غزنوی کی حکومت کے حدود میں تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بات کی تصدیق کتاب '' الصیدنہ '' کے اقتباسات سے بھی ہوجاتی ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے :

" ملتان اور سندھ کے درمیان جو جنگل واقع ہیں ' ان میں میں نے دیکھا کہ دو طرح کی بوٹیاں اس چیز کی پیدا ہوتی ہیں (یہاں اس چیز سے بوٹی " جرجیز " مراد ہے)۔"

(البیرونی اور جغرافیہ عالم۔ ص 105)

اسی کتاب میں سیب کے اقسام پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" میں نے کشمیر کے پہاڑوں میں ایک قسم کا سیب دیکھا جو قسم

اہلی سے مختلف نہیں ہے ' البتہ اس کے درخت میں کانٹے بہت زیادہ
ہوتے ہیں۔"

(البیرونی اور جغرافیہ عالم۔ص 105)

اس طرح ان دونوں بیانات سے مولانا آزاد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ البیرونی نے سندھ' پنجاب اور کشمیر تینوں ہی علاقوں کی سیر کی تھی۔ ان کے خیال میں غالباً وہ غزنی سے کابل گیا۔ کابل سے پشاور اور وہاں سے لاہور اور کشمیر کی سیر کرتے ہوئے ملتان گیا۔ غالباً سنسکرت کے سیکھنے اور تحقیقات انجام دینے کے لئے ایک بڑا عرصہ اس نے یہیں بسر کیا۔ اور اس کی واپسی ملتان سے سندھ اور سندھ سے غزنی ہوئی ہوگی۔ البیرونی کے ہندوستان میں قیام کے بارے میں ڈاکٹر سخاؤ نے یہ قیاس کیا تھا کہ وہ 410 ہجری کے بعد ہندوستان آیا اور غالباً نو دس برس تک یہیں رہا۔ مولانا نے بیرونی کی کتابوں کے مطالعہ سے اس دور کی تصدیق کی ہے۔

عنوان " البیرونی کی دماغی سیرت " کے تحت مولانا فرماتے ہیں کہ اس میں سب سے نمایاں خصوصیت جو پائی جاتی تھی وہ اس کا علمی اور سائنٹفک دماغ تھا جو ہمیشہ ہر صورت میں کارفرما رہتا۔ اس خصوصیت کو کوئی دینی عقیدہ' قومی روایت یا تاریخی حقیقت کبھی متاثر نہ کرسکی۔ اس کی عقل نہ ہی لچکدار تھی اور نہ داغدار۔ کوئی بھی شخص اس کی عقل و فراست کو تسخیر نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی تصنیف کردہ تمام کتابوں میں اس کی عقل' اس کا غور و فکر اور اس کا ذاتی تجربہ حاوی رہا۔ چاہے وہ " الآ ثار الباقیہ" اور " کتاب الہند" ہوں چاہے کتاب " الصیدنہ" اور " الجماہر" ہوں کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ ایسی تمام لغو اور شہرت رکھنے والی بے بنیاد خبروں اور روایتوں کو غلط قرار دیتا ہے جن کے ماننے سے عقل انکار کرتی ہے یا تجربہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر روایتوں کے اعتبار سے سیلون (سری لنکا) میں پایا جانے والا جبل البرق (بجلیاں چمکانے والا پہاڑ) سرخ گندھک سے متعلق عجیب و غریب خواص کی شہرت' سنگ یدہ جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اسکے ذریعہ جب چاہو بارش ہوسکتی ہے' روم کے کنسیہ اصطفانوس (Santo Stefano) کے ایک ہزار دروازے اور بیس ہاتھ لانبی زمرد کی قربان گاہ جیسی عقل و ادراک سے بعید وہم پرستانہ باتیں جو کافی شہرت رکھتی تھیں' روایت بن کر کئی ایک کتابوں میں شامل ہوتی آرہی تھیں۔ البیرونی ان تمام باتوں کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ البیرونی فولاد اور اس کی قسموں پر

روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب ''القانون'' میں ایک مقام پر تحریر کرتا ہے:

" فولاد کے بارے میں ایک کہانی بیان کی جاتی ہے اور اگرچہ کثرت کے ساتھ تاریخ کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے لیکن خرافات میں داخل ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب قندھار فتح ہوا تو وہاں فولاد کی ایک لاٹ ملی جو ستر ہاتھ لمبی تھی اور جب ہشام بن عمرو نے اس کے نیچے کی زمین کھدوا ڈالی تو معلوم ہوا کہ تیس ہاتھ کے قریب اس کا نچلا حصہ زمین کے اندر تھا۔ پھر جب اس لاٹ کی حقیقت دریافت کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ ملوک تبع یمن کی یادگار ہے۔ وہ ایرانیوں کے ساتھ آئے تھے اور جب ہندوستان پر قابض ہوگئے تو انہوں نے اپنی تلواریں پگھلاکر یہ لاٹ تیار کرائی۔ "

(البیرونی وجغرافیہ عالم۔ص 109-110)

البیرونی اس حکایت کا مذاق اڑاتا ہے اور اس کے امکان کو رد کر دیتا ہے۔ اس معاملہ میں اس کا یہ استدلال ہے کہ کیا کوئی بادشاہ اپنی فوج کے اسلحہ کو اس طرح ضائع کر کے انہیں اسلحہ سے محروم کر دے گا۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے ماہرین علم وفن کی علمی تحقیقات کو قبول کرنے کے معاملہ میں بھی وہ بڑا محتاط ہے۔ ایسی تمام باتیں جو زمانہ بھر میں شہرت رکھتی ہیں اور وہ کسی بھی عالم سے منسوب کیوں نہ ہوں آنکھیں بند کر کے وہ کبھی انہیں قبول نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ وہ حقائق اس کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ البیرونی علمی فیصلوں میں حقیقی، تجرباتی اور عقلی نقطہ نظر کا قائل تھا۔

'' البیرونی اور جغرافیہ عالم'' میں آخری ذیلی سرخی '' الصیدنہ اور الجماہر'' ہے۔ یہ دونوں کتابیں البیرونی کے حکیمانہ دماغ کی دین ہیں۔ '' الصیدنہ'' مفرد دواؤں کی تحقیقات اور '' الجماہر'' جواہرات کی تحقیقات کے نتائج پر محیط ہیں۔ ان دونوں ہی اشیا کے مطالعہ میں البیرونی ایک معتبر محقق کی طرح رونما ہوتا ہے۔ جن میں اس کی نگاہ تحقیق بڑی متجسس اور حقیقت پر مبنی تھی۔ مولانا کا یہ ماننا ہے کہ اس کے لئے دلیل اور حجت کی شکل میں صرف اس کی عملی تحقیق اور عقلی تصدیق اہمیت رکھتی ہے۔ عوامی اعتقاد، مخصوص شخصیت کی کوئی روایت، سیاحوں کا مشاہداتی تذکرہ اور کسی بھی مستند کتاب کا کوئی بیان اس کے لئے کوئی معنی نہیں

رکھتا۔ اس زمانے میں جڑی بوٹیوں اور قیمتی پتھروں کے متعلق کئی باتیں مشہور ہوگئی تھیں۔ ان باتوں پر ہر کوئی نہ صرف یقین رکھتا تھا بلکہ فنی کتابوں میں ان کے تذکرے ملتے تھے۔ جہاں تک البیرونی کا تعلق ہے اس نے ان باتوں کو کبھی بھی اہمیت نہ دی بلکہ صرف اپنے تجربہ اور ذاتی علم کی حاصلات کی دلالت کو پیش کیا کرتا تھا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ البیرونی نے معدنیات پر بھی تحقیق کی جس کے بہت ہی عمدہ نتائج برآمد ہوئے۔ خاص کر فولاد اور نرم لوہے کی نوعیت اور ان کے اقسام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ نرم لوہا جس سے تلواریں اور خنجر تیار کئے جاتے ہیں اس سے متعلق وہ یہ تسلیم کرتا تھا کہ ہندوستان اس صناعی میں دیگر مما لک سے بہت آگے ہے۔

اس طرح مولانا آزاد نے اپنے مقالہ '' البیرونی اور جغرافیہ عالم'' میں البیرونی کی سیاحت' مشاہدات اور تحقیقات پر مشتمل علم جغرافیہ پر لکھی گئی اس کی کتابوں کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا کہ وہ ایک ہوشمند اور صداقت وحقیقت پسند محقق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحقیقات سے برآمد نتائج میں صدیوں کے گزر جانے کے باوجود آج بھی تازگی پائی جاتی ہے۔

مولانا آزاد اور ملک میں سائنس کی ترقی

کسی ملک کی آزادی کے بعد اس کی ترقی کا دارومدار رہنماؤں کی فکرونظر اور بصیرت پر ہوتا ہے۔ خاص کر ابتدائی دس بارہ سال کا عرصہ تو بڑا ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ارباب اقتدار اس دور میں ملک اور قوم کو جس راہ پر گامزن کریں گے وہ اسی راہ پر چل پڑیں گے۔ مستقبل کے تقاضوں کے پیش نظر جس طرح کے اقدامات کیے جائیں گے، جس قسم کے منصوبے بنائیں جائیں گے اور جتنی تیزی کے ساتھ انہیں روبہ عمل لایا جائیگا' ملک اتنی ہی تیزی کے ساتھ ترقی کرے گا۔

ہمارے ملک کی آزادی سے قبل ہی ستمبر 1946 ء میں عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد اس حکومت میں شامل نہیں تھے۔ وزیراعظم جواہر لعل نہرو کے اصرار پر 15 جنوری 1947ء کو وہ وزارت میں شامل ہوئے اور مہاتما گاندھی کے مشورہ پر انہوں نے وزیر تعلیم کا قلمدان سنبھالا۔ بعد میں سائنس اور کلچر کی زائد ذمہ داری بھی انہیں سونپی گئی۔ 1952ء میں جب پہلے عام انتخابات عمل میں آئے تو اس کے بعد مولانا آزاد وزیر تعلیم' قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیقات مقرر ہوئے۔ 1957ء کے دوسرے عام انتخابات کے بعد انہوں نے دوبارہ وزیر تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت کا قلمدان سنبھالا۔ اس وزارت پر وہ 22 فروری 1958ء میں اپنی وفات تک قائم رہے۔

آزادی کے فوری بعد گاندھی جی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے اور اس کے دو سال بعد سردار پٹیل بھی چل بسے۔ چنانچہ ملک کے پہلے وزیراعظم کو نئی قوم کے لئے تعمیری اور ترقیاتی منصوبوں کی تدوین اور ان کی تکمیل کے لئے قوانین وضوابط کی ترتیب میں مولانا آزاد کے مشوروں کی ہمیشہ ضرورت رہی۔ جب بھی زمانے کو عصر حاضر سے مربوط کرنے اور سماج کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بات کی جاتی ہے وہ سائنس اور ٹکنالوجی کے حوالے کے بغیر مکمل متصور نہیں ہوتی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آزاد ہند کی

تعمیر میں اس کے پہلے وزیر اعظم اور وزیر تعلیم و سائنس، سائنس کی ترقی اور ٹکنالوجی کے فروغ کو اور ان علوم میں اعلیٰ تعلیم کو اہمیت دیے بغیر ملک کے لئے منصوبے بناتے۔

تاریخی شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں جدید تعلیم کی شروعات کے نتیجہ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے باوجود ایک طویل عرصے تک یہاں سائنس کے تحقیقی کاموں کے لئے بہت کم ہمت افزائی کی گئی۔ 1876ء میں Indian Association for Cultivation of Sciences کلکتہ میں قائم کیا گیا جس میں مہندر لال سرکار کی ذاتی دلچسپی اور انفرادی کاوش کو بڑا دخل تھا۔ جمشید جی ٹاٹا کی فراخدلی اور بصیرت کی وجہ سے 1911ء میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور قائم ہو سکا۔ جگدیش چندر بوس کی سائنس میں بے لوث خدمت کی بدولت 1917ء میں بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کا قیام عمل میں آیا۔ ان اداروں کے قیام نے یونیورسٹیوں میں سائنس کی تحقیق کے لئے راہیں ہموار کیں اور سائنس کے مختلف شعبوں میں تحقیق کے لئے رہنمائی کی۔ سائنس کی تحقیق کے پیچھے بنیادی مقصد علم کا حصول اور اس کا فروغ تھا۔ مختلف صنعتوں اور صنعتی اداروں کے قیام میں نہ ہی کوئی دلچسپی تھی اور نہ کسی نے ان سے استفادہ حاصل کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی گیارہ سالہ دور وزارت ہندوستان کی تعلیمی ارتقا کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ فنی تعلیم کی کل ہند مجلس کی تنظیم جدید، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام، کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ CSIR کا تحرک اور اس کے تحت سائنسی تحقیقات کے قومی اداروں کا قیام، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کی تیزی کے ساتھ ترقی جیسے اہم امور اسی دور میں انجام پائے۔ اسی اثنا میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس نے سائنس و ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کی۔ اس ادارے میں ہوا بازی سے متعلق ایرونائیکل انجینئرنگ، اندرونی احتراق سے متعلق Internal Combustion Engineering، خام دھاتوں کو صاف کرنے سے متعلق Metallurgy اور کیمیاوی اشیا سے متعلق Chemical Engineering میں خاص طور پر توجہ دی گئی۔ بعد میں یہاں ہائی وولٹیج انجینئرنگ اور پاور انجینئرنگ کے شعبے بھی قائم کئے گئے۔

ہندوستان میں تحریک آزادی کے دور کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہاں چند برطانوی اساتذہ اور سائنس دانوں نے سائنس میں تحقیقات کی غرض سے انفرا اسٹرکچر تیار کیا اور چند تحقیقی مراکز بھی

قائم کئے ۔ان کے علاوہ قومی جذبہ رکھنے والے چند ہندوستانی ماہرین' سائنس کی تحقیق میں منہمک ہو گئے اور صنعتوں کا قیام بھی عمل میں لے آئے ۔ان صنعتوں میں لوہا اور اسٹیل کی بنیادی صنعتیں اور روزمرہ استعمال کی اشیا کی صنعتیں جیسے ٹکسٹائل اور دواؤں کی صنعتیں قابل ذکر ہیں۔دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر دنیا بھر میں سائنس کافی وسعت اختیار کر چکی تھی ۔ نیوکلیر سائنس' راڈار' Antibiotics جیسے سائنس کے نئے میدانوں میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ جب کہ ملک کی آزادی کے بعد پنڈت نہرو کی رہنمائی اور مولانا آزاد کی وزارت میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے لئے ملک کی پالیسی اہم آلہ کا درجہ اختیار کر رہی تھی۔

مولانا آزاد نے اپنی عملی زندگی کی شروعات ایک صحافی کی حیثیت سے کی' جس میں مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے' تحریک آزادی میں ہم وطنوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے اور آزاد ہندوستان کی اہمیت اور اس کے تصور کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سائنسی فکر ونظر کو عام کرنے' انہیں توہم پرستی سے چھٹکارہ دلانے' سائنس کی تعلیم کے حصول کی ترغیب دینے اور سائنسی علوم کو فروغ دینے کے لیے خدمات انجام دیں۔ ان میں بیشتر امور کی عملی طور پر انجام دہی کے لیے وزارت تعلیم و سائنس کا قلمدان بہت معاون ثابت ہوا۔اس طرح مولانا نے ملک میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک بشمول سائنس' ٹکنالوجی وفنی تعلیم) کے حصول کا اہتمام کیا۔ سائنسی تحقیقات اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے درکار پروگرام اور منصوبے بنائے اور انہیں تکمیل کو پہنچانے کے لیے کئی سائنسی' صنعتی' تحقیقی وتربیتی اداروں کا قیام عمل میں لائے جن میں انفرااسٹرکچر اور دیگر سہولتوں کی فراہمی کو اولین فوقیت حاصل رہی

مولانا آزاد کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ فنی تعلیم کے بغیر ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہو سکتی اور معاشی ترقی کی رفتار میں اضافہ مقصود ہو تو فنی تعلیم میں توسیع بے حد ضروری ہے۔مولانا ان باتوں کا اظہار تعلیم سے متعلق اپنی بیشتر تقریروں میں کر چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے 1951ء میں اپنے ایک خطاب میں فنی تعلیم سے متعلق کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے :

> " وزارت تعلیمات کا جائزہ حاصل کرتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ فنی تعلیم کے حصول کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا

کرسکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جو ملک سے باہر جاتی تھی خود ملک میں یہ تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ میں اس دن کا منتظر تھا اور اب بھی ہوں جب ہندوستان میں فنی تعلیم کی سطح اتنی بلند ہوجائے کہ باہر سے لوگ ہندوستان اس غرض سے آئیں گے کہ یہاں اعلیٰ سائنس اور فنی تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ ''

(کتاب التذکرہ۔ ہمایوں کبیر۔ ص 131)

1947ء کی ابتدا میں حکومت ہند نے Scientific Manpower Committee قائم کی اور ملک کے حرکیاتی سائنس داں ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر کو اس کا صدر مقرر کیا۔ اس کمیٹی کو اس بات کا اندازہ لگانا تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تحقیق کے میدان میں 1947ء سے 1957ء تک ملک کو کتنے فنی عملے کی ضرورت پیش آئے گی اور اس مقصد کے حصول کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس کمیٹی نے ایک پنچ سالہ منصوبہ کی سفارش کی اور چند تجاویز پیش کیں جن میں سے چند اہم تجاویز یہ تھیں :

1) سائنس اور ٹکنالوجی کے وہ شعبے جن پر اس وقت تک کام نہیں ہوا تھا ان کے لئے مخصوص نصاب کی تیاری اور اس کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام۔

2) موجودہ اداروں میں حسب گنجائش تعلیم و تحقیق کے امور میں توسیع۔

3) ملک میں موجود پالی ٹکنکس میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام۔

4) فنی عملے کے نگران کاروں کی صنعت وحرفت کے ساتھ تربیت۔

5) منتخب اداروں میں منطقہ واری اساس پر پروڈکشن انجینئر نگ اور ڈیزائن انجینئر نگ کی تعلیم کیلئے سہولتوں کی فراہمی۔

6) فنی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے تعلیم کے اختتام پر عملی تعلیم و تربیت کے حصول کا انتظام۔

ان تجاویز کو روبہ عمل لایا گیا جس کے نتیجہ میں فنی تعلیم کی سہولتوں میں کافی اضافہ ہوا اور اس کے حصول کی نئی راہیں کھل گئیں۔ قومی رہنماؤں اور وزارت تعلیم کے لئے ایک بہت ہی اہم مسئلہ یہ درپیش تھا

کہ آزادی کے بعد یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم کیا ہو؟ اس پر بڑے غور وخوص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ انگریزی ذریعہ تعلیم کو یکایک اعلیٰ تعلیم کے لئے ختم نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ اس کو مزید پانچ سال تک برقرار رکھا جائے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ہندوستان کی کسی زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کیا جائے۔ لیکن اس میں ایک اہم مسئلہ علوم کے لئے اصطلاحوں کا درکار تھا جس کے لئے Central Advisory Board نے ایک حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لحاظ سے چونکہ انگریزی میں سائنسی اصطلاحات بین الاقوامی معیارات کی ہوتی ہیں اس لئے ان کو ترجمہ کے بغیر جوں کا توں استعمال کیا جانا چاہیے خواہ یونیورسٹی سطح پر تعلیم کسی بھی ہندوستانی زبان میں کیوں نہ دی جائے۔ پانچ سال بعد انگریزی ذریعہ تعلیم کو جاری رکھنے کے فیصلے کو مزید پانچ سال تک کی توسیع دی گئی۔ جس کی مدت بڑھتی ہی گئی۔

مولانا آزاد کا یہ ماننا تھا کہ پنج سالہ منصوبہ کا مقصد صرف زرعی پیداوار، صنعت وحرفت، بجلی، ذرائع آمدورفت اور دوسرے زمروں میں ترقی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس میں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اہل ملک اور نئی نسل کی ذہنی تربیت صحیح طور پر ہو تا کہ انہیں اچھے شہری بننے کا موقع مل سکے، وہ یہ جانتے تھے اور اس کا اظہار بھی کیا کرتے تھے کہ ملک میں سائنسی یا دوسری قسم کی استعداد کی کوئی کمی نہیں۔ صرف یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کو کس طرح بروئے کار لایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی طرف ان کا دھیان ہر وقت مبذول رہتا تھا۔ 1950ء میں مولانا نے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ”فنی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے جو لائحہ عمل ہمارے پیش نظر تھا وہ چار اعلیٰ حرفیاتی اداروں کا قیام نیز موجودہ اداروں کی تقویت تھی۔ مالیہ نے اجازت نہیں دی کہ ہم چاروں کا ایک ساتھ قیام عمل میں لائیں، لیکن ہم نے سوچا کہ کام کی ابتدا تو کی جانی ضروری ہے۔ اس لئے بغیر تمام ضروری عمارتوں کی تعمیر کا انتظار کئے کلکتہ سے قریب مشرقی اعلیٰ حرفیاتی ادارہ قائم کیا گیا۔ ابھی کام ہو رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ

آئندہ تعلیمی سال میں ہم اساتذہ و طلبا کے پہلے گروہ کو اس ادارہ میں کام کرتا پائیں گے ۔ ساتھ ساتھ ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ موجودہ اداروں کی حالت کو بہتر بنائیں اور ان کی کارکردگی کی صلاحیت میں اضافہ کریں ۔ "

(کتاب التذکرہ۔ ہمایوں کبیر۔ ص127)

اعلیٰ فنی تعلیم اور تربیت کے لئے مولانا آزاد کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے 1951ء میں کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائیر ٹکنالوجی کے قیام کو عملی شکل دی جس نے بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی IIT کھڑک پور کے نام سے ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔ 1950ء میں حکومت بنگال نے صنعتی ادارے کی تعمیر کے لیے کھڑک پور میں وزارت تعلیمات کو بارہ سو ایکڑ زمین پیش کی۔ اس ادارے کی ابتدا دو سو طالب علموں کے داخلہ سے ہوئی جنہیں تین ہزار درخواستگاروں میں سے چنا گیا تھا۔ یہ ادارہ ایک سال کے عرصہ میں مزید ترقی کی طرف گامزن ہوا۔ انجینئرنگ کے بنیادی کورسز میں داخلوں کے ساتھ اس میں نیول آرکیٹکچر، اگریکلچرل انجینئرنگ اور آرکیٹکچر کی ڈگریوں کے لئے داخلہ دیا گیا۔ پروڈکشن انجینئرنگ اور Combustion Engineering میں پوسٹ گریجویشن کورسز بھی شروع کئے گئے ۔ چند طلباء نے انجینئرنگ کے کئی میدانوں میں تحقیق کی غرض سے داخلہ لیا۔ اس ادارے نے Managment Studies میں مختصر مدتی کورس بھی شروع کیا جو ان دنوں سارے ایشیا میں اپنی نوعیت کا واحد کورس رہا۔ اس کورس میں صنعت، کامرس، سرکاری محکموں اور دوسرے اداروں سے وابستہ لوگوں نے داخلہ لیا اور کارگر ایڈمنسٹریشن کے مشترکہ اصولوں کی جانکاری حاصل کی۔ اس ادارے میں طلبا کی جملہ تعداد بڑھ کر سات سو ہو چکی تھی اور مزید ایک سال بعد ایک ہزار طلبا نے اس میں داخلہ لیا۔ اس طرح مولانا آزاد کے دور وزارت میں قائم کیا گیا ایک چھوٹا سا ادارہ آگے چل کر بہت بڑے ادارے کی صورت اختیار کرتا گیا۔

کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ CSIR کا قیام 1942ء میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن اس کے توسیعی کام 1949ء سے شروع ہوئے۔ پنڈت نہرو بحیثیت وزیر اعظم اس کے صدر اور مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم و سائنس اس کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ پنڈت نہرو بحیثیت صدر CSIR کی تمام

ترقی کے ذمہ دار تھے۔ مولانا آزاد اس کے روزمرہ معمولات کے نگراں ہونے کے علاوہ اس کے طویل مدتی منصوبوں میں شریک رہے۔ مولانا نے CSIR کے لئے سائنس کے انفرا اسٹرکچر کی ترقی کو جو سمت بخشی تھی وہ لائق تحسین ہے۔ بقول مولانا آزاد" وہ CSIR کے امور میں بحیثیت وزیر نہیں بلکہ بحیثیت آفس بیرر کے شامل رہتے تھے۔" قوم کی ترقی میں سائنس کے اہم رول کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات بالکل واضح تھے۔ وہ اپنے ملک کے سائنسی ماہرین کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ سائنسی علوم کو سماجی ترقی کے لئے بروئے کار لائیں۔ اور اس بات کا انتباہ دیتے ہیں کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی دریافتوں اور ایجادات کے انسانیت سوز استعمال سے باز رہیں۔

مولانا آزاد 1952ء میں سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں آزادی کے بعد ملک میں سائنس کی ترقی، ٹکنالوجی کے فروغ اور تکنیکی تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس عرصہ میں تکنیکی تعلیم کی فراہمی میں بہت بڑی ترقی ہوئی۔ آل انڈیا کونسل برائے ٹکنیکل ایجوکیشن اور سائنٹفک مین پاور کمیٹی کی سفارشات کو روبہ عمل لاتے ہوئے یونیورسٹیوں اور دیگر اعلیٰ فنی اداروں کو تعلیم اور تحقیق کے لئے فراخدلانہ طور پر گرانٹ منظور کی گئی۔ ڈیولپمنٹ پروگرام کے پہلے مرحلے میں ملک کے مختلف حصوں میں چودہ تکنیکی اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور کو وافر مقدار میں جاری کی گئی گرانٹ کے نتیجہ میں اس کے موقف میں نمایاں تبدیلی آئی اور اس کے تحت سائنس اور ٹکنالوجی کے کئی بنیادی شعبوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم اور تحقیق کو بروئے کار لایا جاسکا۔ دہلی پالی ٹکنیک کی ترقی اس حد تک عمل میں آئی کہ وہ دہلی یونیورسٹی کے لئے ٹکنالوجی کے شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے سکے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کھڑک پور انجینئرنگ وٹکنالوجی کے شعبے میں تحقیق وتدریس کی اعلیٰ سہولتیں فراہم کی گئیں۔ مولانا کو اس بات کی قوی امید تھی کہ مستقبل میں یہ ادارہ ملک میں اعلیٰ تکنیکی تعلیم اور تحقیق میں ترقی کے لئے ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔

ابتدائی پانچ برسوں میں سائنس کی ترقی کے لیے فراہم کی گئی سہولتوں کا احاطہ کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کو اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ جنگ کے لئے درکار ذرائع بڑھائے جاسکیں۔ لیکن ملک میں قومی حکومت کے قیام کے بعد اس کے فرائض امور میں وسعت دی گئی اور اس میں قومی زندگی اور ترقی کے تمام پہلوؤں کو شامل کیا گیا۔ اس عرصہ میں نہ صرف اس

کے دائرہ کار میں وسعت آئی بلکہ سائنسی تحقیق کے نت نئے شعبوں کا اضافہ بھی ہوا۔

ملک میں تیز تر ذرائع حمل ونقل کے لئے درکار سڑکوں پر تحقیق کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ بغیر مناسب رسل ورسائل کے زراعت، انڈسٹریز اور کامرس کو ترقی نہیں دی جاسکتی۔ مولانا کا یہ ماننا تھا کہ زرعی پیداوار کی بڑھتی ہوئی مانگ کی بدولت مناسب ذرائع ترسیل کے بغیر نہ تو دیہاتوں کے لئے ضروری زرعی آلات، کھاد اور سائنسی وتکنیکی جانکاری فراہم کی جاسکتی ہے اور نہ ہی ایک دیہات سے دوسرے ضرورت مند دیہات تک غلہ اناج پہنچایا جاسکتا ہے۔ 1950ء تک آزاد ہندوستان میں موٹر گاڑیوں کی کل تعداد تین لاکھ بھی نہ تھی جبکہ برطانیہ میں ان کی تعداد 44 لاکھ اور امریکہ میں تقریباً پانچ کروڑ گاڑیاں موجود تھیں۔ آمد ورفت کے لئے دستیاب سڑکوں کا تناسب بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ فی ہزار آبادی کے لئے چھ فرلانگ لمبی سڑک بھی میسر نہیں تھی۔ برطانیہ میں فی ہزار آبادی پر 3.6 میل لمبی سڑک اور امریکہ میں فی ہزار آبادی پر 21 میل لمبی سڑک دستیاب تھی۔ یہی وجہ رہی کہ ملک کے لئے قابل اطمینان سڑکوں کے نظام، ان کی تعمیر سے متعلق مسائل، اقل ترین خرچ پر سڑکوں کی دیکھ بھال اور دیہی علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر اور ان پر گاڑیوں کے استعمال کے مطالعہ کے لئے ایک تحقیقی ادارے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور اس کی تکمیل کے لئے سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ CRRI کا قیام عمل میں لایا گیا اس تحقیقی ادارے کا افتتاح مولانا آزاد کے ہاتھوں 16 جولائی 1952ء کو عمل میں آیا۔ اس ادارے نے کم لاگتی سڑکوں کی تعمیر، ان کی دیکھ بھال اور ان کی ترقی کو فوقیت دیتے ہوئے درج ذیل امور پر توجہ مرکوز کی۔

1) سڑکوں کی تعمیر اور ان کی مضبوطی کے لئے تحقیق۔

2) روڈ میٹیریل ، تعمیر اور سڑکوں کی اصلی حالت میں برقراری کے لئے بنیادی اور اطلاقی تحقیق۔

3) سڑکوں کے معیارات کے لئے خصوصی جانچ کے پیمانوں کا قیام

4) سڑکوں کی مختلف امتحانی جانچ کے لئے مناسب آلہ جات کی ایجاد۔

5) مٹی کی میکانیات (Soil Mechanics) اور مٹی کی جانچ کے لئے مطالعہ، تاکہ دیہی سڑکوں کو تمام موسمی حالات میں استعمال کے قابل بنایا جاسکے۔

6) ٹریفک کی مختلف حالتوں میں مختلف قسموں کی سڑکوں کی خصوصیات اور ان کی حالت کا مطالعہ۔

7) اتفاقی حادثات، سڑک کے اعداد وشمار اور حفاظتی آلات کی تیاری۔

اس ادارے کے علاوہ CSIR کے تحت عمارتوں کی تعمیر اور تحقیق کے لئے بھی ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا جو سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ CBRI کہلایا۔

سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کو 1953ء میں روڑ کی میں قائم کیا گیا۔ اس ادارے کا افتتاح مولانا آزاد کے ہاتھوں 12 اپریل 1953ء کو عمل میں آیا جو CSIR کے تحت پہلے پنچ سالہ منصوبہ میں قائم ہونے والی گیارہ قومی لیبارٹیریوں میں سے آخری لیبارٹری تھی۔ آزادی کے ابتدائی پانچ سال میں ان لیبارٹیریوں کا قیام ہندوستان کی صنعتی ترقی کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ ہمارے ملک کی قومی صنعتوں کے ارتقا اور فروغ میں سائنس اور ٹکنالوجی کو بروئے کار لانے کی یہ پہلی با قاعدہ اور منصوبہ بند کوشش تھی۔

سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو CSIR کے تحت تشکیل کردہ بلڈنگ ریسرچ کمیٹی کی سفارشات پر قائم کیا گیا۔ اس کی شروعات تھامسن کالج آف انجینئرنگ کے تعاون سے بلڈنگ ریسرچ یونٹ کے سیٹ اپ کے ساتھ ہوئی جو بعد میں ٹکنیکل یونیورسٹی آف روڑکی کہلائی۔ جس کی بلڈنگ کا سنگ بنیاد فروری 1951ء میں رکھا گیا تھا۔

اس ادارے میں کی جانے والی تحقیقات میں سے چند تحقیقات خصوصی طور پر ملکی ضروریات کا احاطہ کرتی تھیں۔ یہ ادارہ منطقہ حارہ کی Tropical Conditions کے لئے آرام دہ مکانات کی تعمیری ضروریات، مٹی میں مضبوطی اور استحکام کا مطالعہ، دیسی مٹیریل کا استعمال، صنعتی فضلہ کو کارآمد بنا کر اس کو استعمال میں لے آنا۔ کم آمدنی والے مکینوں کے لئے بڑے پیمانے پر مکانوں کی تعمیر جیسے مسائل پر خاص توجہ دینے کا مجاز تھا۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو ذیل کے چار اہم زمروں کے تحت تحقیقی ذمہ داری سونپی گئی۔

1) بلڈنگ مٹیریل
2) تعمیر کے طریقے
3) عمارتوں میں قیام کی صلاحیت
4) سروے اور اطلاعات

اس ادارے میں ایسے ڈیویژن قائم کئے گئے جو بلڈنگ مٹیریلس کی تیاری اور جانچ کر سکیں۔ اس

ادارے کی یہ بھی ذمہ داری رہی کہ وہ کیمسٹری، آرکیٹکچرل فزکس اور انجینئرنگ کے ڈیویژنوں کے لئے سائنسی اور تکنیکی جانکاری فراہم کرے۔

ہندوستان میں جدید سائنسی تحقیقات کو روبہ عمل لانے اور ملک کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے CSIR کے تحت ایک اور ادارہ ''الکٹرانک انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' قائم کیا گیا جس کا سنگ بنیاد مولانا آزاد کی موجودگی میں ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے 21 ستمبر 1953ء کو رکھا تھا۔ اس ادارے کے قیام سے ملک میں قومی اداروں کی تعداد 12 تک پہنچ چکی تھی۔ سنگ بنیاد کے موقع پر مولانا آزاد نے اپنے خطاب میں الکٹرانکس کی تحقیق اور ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران دنیا نے الکٹرانکس کے شعبے میں کافی حد تک ترقی کر لی تھی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ دنیا میں کوئی صنعت اور سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں الکٹرانکس کے آلات سے استفادہ نہ کیا گیا ہو۔ الکٹرانکس کی تحقیق ہی راڈار کی ایجاد کا موجب بنی جس کے ذریعہ جنگ عظیم کے دوران دشمن کے ہوائی جہازوں اور آب دوزوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جاسکی۔ الکٹرانکس مشینوں کے ذریعہ مشکل ترین مساواتوں کو بہ آسانی حل کرتے ہوئے انسانی وقت اور محنت کو رائیگاں ہونے سے بچایا جاسکا۔ کئی ایک مسائل کے حل کے لئے ماہرین ریاضی کو جہاں کئی سال درکار ہوئے وہیں ان مشینوں نے صرف چند گھنٹوں میں انہیں حل کر دیے۔ صنعتوں میں دھاتوں کو پگھلانے کیلئے ان میں سختی پیدا کرنے کے لئے پلاسٹکس کو گرم کرنے اور کیمیائی تعاملات کو کنٹرول کرنے کے لئے الکٹرانکس آلات مددگار ثابت ہوئے۔ ریڈیائی مواصلات اور ٹیلی ویژن کے لئے آواز اور تصویروں کی ترسیل میں الکٹرانکس کی تحقیق کارگر ثابت ہوئی ہے۔

دوسرے ملکوں میں الکٹرانکس کی ترقی کے مقابلے میں ہمارے ملک میں برائے نام کام ہوا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف الکٹرانکس، نیشنل فزیکل لیبارٹری نئی دہلی اور ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ بمبئی (موجودہ ممبئی)، وہ ادارے تھے جہاں ریڈیو اور الکٹرانکس پر تحقیق جاری تھی۔ اس بات کا شدید احساس تھا کہ یہ تین ادارے ملک کے لئے درکار الکٹرانکس کی سہولتوں کی فراہمی اور ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کی گئی جو ان تمام امور کی پابجائی کرسکے۔ تحقیقات سے یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ دیسی میٹریل کے استعمال سے ریڈیو

کے لئے کل پرزوں کی تیاری کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن بڑے پیانے پر یہ کام اسی وقت تکمیل کو پہنچ سکتا تھا جب ملک کا کوئی قومی ادارہ اس میدان میں تحقیقی کام کے لیے مخصوص ہو۔ چنانچہ نامور ماہرین کی خدمات سے استفادہ کیا گیا اور سنٹرل الکٹرانکس انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پلانی (رجستھان) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کے مقاصد میں دیسی خام میٹر یلکو استعمال میں لاکر معیاری اور قابل بھروسہ الکٹرانکس کے پرزوں کی تیاری' الکٹرانکس سرکٹس کو استعمال کرتے ہوئے ملک کی صنعتوں کی کارکردگی کو ترقی دینا' مختلف پیداواری اشیا کی جانچ کے لیےمعیاری الکٹرانکس آلات بنانا' خاص قسم کے ریڈیائی سرکٹس کی ترقی 'میڈیکل پروفیشن کے لئے الکٹرانکس آلات کی ترقی اور تیاری' مواصلات' راڈار اور دوسرے آلات کے لئے تجربات عمل میں لانا' صوتی آلات کی ترقی و تیاری اور الکٹرانکس کو صنعتوں میں استعمال میں لانا شامل تھا۔ ان تمام مقاصد کی براری کے لئے اس ادارے کو ذیل کے ڈیویژنوں میں تقسیم کیا گیا۔

1) الکٹرانکس سرکٹس (Electronic Circuits)
2) مواصلاتی آلات (Communication Equipment)
3) صنعتی الکٹرانکس (Industrial Electronics)
4) الکٹرانک پرزے (Electronic Components)
5) حررواني والوز (Thermoionic Valves)
6) الکٹرانک آلات (Electronic Instruments)
7) طبی آلات (Medical Apparatus)
8) صوتی آڈیو آلات (Acoustic-Audio Equipments)
9) تھیٹر اور اسٹوڈیو آلات (Theatre and Studio Equipments)
10) بہت زیادہ فریکونسی والے آلات (Very high frequency Equipments)

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی وزارت کے گیارہ سالہ دور میں سائنس کی تحقیق و ترقی' ٹکنالوجی اور تکنیکی تعلیم کی اشاعت اور فروغ کے لئے متعدد اقدامات کئے اور ان میدانوں میں ملک کی ترقی کے لئے نئی سمتیں متعین کیں۔

کتابیات

1) آزادی کہانی، خود ان کی زبانی — بہ روائت : عبدالرزاق ملیح آبادی

2) تذکرہ — ابوالکلام آزاد، مرتبہ : مالک رام

3) البیرونی اور جغرافیۂ عالم — ابوالکلام آزاد، مرتبہ : ضیاالحسن فاروقی اور مسیح الحسن

4) غبار خاطر — ابوالکلام آزاد

5) ہماری آزادی(India wins Freedom) — مترجم : شمیم حنفی

6) India's Maulana Centenary Vol.I — Edited by : Syeda Saiydain Hameed

7) India's Maulana Centenary Vol.II — Edited by : Syeda Saiydain Hameed

8) ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش — پروفیسر عبدالمغنی

9) کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں — مالک رام

10) مولانا ابوالکلام آزاد، فکر ونظر کی چند جہتیں — ضیاءالحسن فاروقی

11) مولانا ابوالکلام آزاد — ایڈیٹر : پروفیسر ہمایوں کبیر

کتاب التذکرہ — مترجم : ڈاکٹر میر ولی الدین

12) ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت — مرتبہ: رشیدالدین خاں

13) مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے — مرتبہ : ڈاکٹر خلیق انجم

14) خطوط ابوالکلام آزاد — مرتبہ : مالک رام

15) ابوالکلام آزاد — شکیل الرحمٰن

16) حیات ابوالکلام آزاد — عبدالقوی دسنوی

17) جدید ہندوستان کے معمار، ابوالکلام آزاد — عرش ملسیانی

18) Speeches of Maulana Azad (1947-1958) published by publication division, New Delhi.

19) مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت، سیاست، پیغام — رشیدالدین خاں

(20	اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری
(21	مولانا ابوالکلام آزاد مذہبی افکار' صحافت اور قومی جدوجہد	ضیاالدین اصلاحی
(22	انوار ابوالکلام	مرتبہ : علی جواد زیدی
(23	مولانا آزاد کا قیام رانچی' احوال و آثار	مرتبہ : جمشید قمر
(24	مولانا آزاد کی ایک سیاسی ڈائری	اثر بن یحییٰ انصاری
(25	مولانا ابوالکلام	غلام ربانی تاباں
(26	Abul Kalam Azad '	Ian Henderson Douglas
(27	حواشی ابوالکلام آزاد	سید مسیح الحسن
(28	انتخاب زمیندار	عتیق احمد صدیقی
(29	ابوالکلام آزاد' فکروفن	ملک زادہ منظور احمد
(30	البیرونی اور جغرافیہ عالم	مرتبہ : ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان' کراچی
(31	مولانا ابوالکلام آزاد' ذہن و کردار	عبدالمغنی
(32	ابوالکلام آزاد' ایک تقابلی مطالعہ	قاسم سید
(33	آئینہ ابوالکلام آزاد	عتیق صدیقی
(34	نقد ابوالکلام	رضی الدین احمد
(35	ہماری آزادی	مرتب: ہمایوں کبیر ' مترجم :محمد مجیب
(36	ہفتہ وار پیغام	ایڈیٹر:عبدالرزاق ملیح آبادی
(37	مضامین لسان الصدق	ایڈیٹر :ابوالکلام آزاد دہلوی' مرتب :عبدالقوی دسنوی
(38	سہ ماہی صبح	ابوالکلام آزاد نمبر 1970ء
(39	فکرونظر سہ ماہی	ابوالکلام آزاد نمبر 1989ء
(40	خدنگ نظر ماہنامہ	مئی 1902ء ' جون 1902 ' جولائی 1902ء ایڈیٹر:نوبت رائے نظر

41) لسان الصدق ماہنامہ

نومبر 1903ء، جون 1904ء، اگست و ستمبر 1904ء

اپریل و مئی 1905ء

ایڈیٹر : ابوالکلام آزاد

42) الندوہ ماہنامہ

مارچ 1906ء

ایڈیٹر: مولانا شبلی نعمانی

43) الہلال ہفتہ وار

2 اپریل 1913ء ، 9 اپریل 1913ء

15 اکتوبر 1919ء ، 14.7 جنوری 1914ء

3 جون 1914ء ، 10 جون 1914ء

یکم جولائی 1914ء ، 15 جولائی 1914ء

29 جولائی 1914ء ، 5 اگست 1914ء

2 ستمبر 1914ء ، 21,14 اکتوبر 1914ء

24 جون 1927ء ، 5 اگست 1927ء

12 اگست 1927ء ، 14 اکتوبر 1927ء

ایڈیٹر : ابوالکلام آزاد

44) البلاغ ہفتہ وار

12 نومبر 1915ء ، 10,3 مارچ 1916ء

18 فروری 1916ء

ایڈیٹر : ابوالکلام آزاد